تاریخی جائزے

ڈاکٹر محمد یسین

عنوان

پبلشرز

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

سنہ ۱۹۶۲ء

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس ناوان محل روڈ لکھنؤ

قیمت :- تین روپیہ (۳؍)



ڈاکٹر محمد یسین

فہرست مضامین

اپنے مُربّی اور محبوب رہنما عزّت مآب ڈاکٹر ذاکر حسین

نائب صدر جمہوریہ ہند

کے نام

سخن بنزدِ سخنداں ادا مکُن حافظ
کہ تحفہ کس دُر و گوہر بہ بحر و کاں نبرد

مسعود حسین

تعارف

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

میں ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب کو اور ان کے ذوقِ تحقیق و تحریر کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ علم تاریخ سے ان کو جو فطری لگاؤ تھا اس کے تقاضے سے انھوں نے ایم۔ اے کے درجے میں پہنچکر ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ کو اپنے خصوصی مطالعے کے لیے منتخب کیا اس پیچیدہ مضمون کے الجھے ہوئے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ تاریخی حقیقتوں کو وہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جن پر تعصبات کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یوں تو ہر انسان وراثت، ماحول، تربیت، مذہب، فطری رجحانات وغیرہ کے دباؤ سے کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی طرح کی عصبیت سے آلودہ ہو جاتا ہے لیکن یٰسین صاحب کی تحریریں بتاتی ہیں کہ تاریخی تحقیق کے وقت وہ ہر طرح کی عصبیت سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں ایک محقق تاریخ میں حقیقت کے بےلاگ اظہار کی جرأت بھی ہونا چاہیئے اور یہ جرأت یٰسین صاحب میں پورے طور پر موجود ہے۔

جو مختصر مضامین اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں وہ عام پسند انداز میں لکھے گئے ہیں۔ وہ صرف مورخین کے لیے نہیں ہیں بلکہ

ان کو ہر شخص دلچسپی کے ساتھ پڑھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے یٰسین صاحب کی تحقیق کی گہرائی دیکھنا ہو تو ان کی وہ کتاب دیکھیے جو انھوں نے پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کرنے کے لیے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔

یٰسین صاحب مورخ ہیں، ادیب نہیں ہیں۔ لیکن تاریخ کو اکثر ادب کا ایک شعبہ سمجھا گیا ہے اور یٰسین صاحب کے یہ مضامین اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں ان کے بیان میں جگہ جگہ وہ دلکشی اور دلنشینی نظر آتی ہے جو ان کی پیش نظر کتاب کو ادب کے دائرے میں لے آتی ہے۔

یٰسین صاحب کی دلی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی انتہائی مصروفیت کی حالت میں یہ چند سطریں تعارف کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ قارئین کتاب سے اُن کا تعارف صحیح معنوں میں تو خود اُن کے وہ مضامین کرائیں گے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

"ادبستان" دین دیال روڈ لکھنؤ

۴ر نومبر سنہ ۶۲ء

سیاسی، مذہبی، ادبی یا سائنسی تاریخ کے سمجھنے کی جدوجہد کا عظیم مقصد، انسانوں کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اترنا اور ان کے تصورات کو گرفت میں لانا ہے تصورات میں تابکاری اور ارتقاء ہوتا ہے، ان کے اپنے اسلاف اور اخلاف ہوتے ہیں جن میں انسان، مجازی والدین کی حیثیت سے، والدین کا کردار، حقیقی والدین سے زائد ادا کرتا ہے۔

لارڈ ایکٹن

برآور آنچہ اندر سینہ داری
نوائے نالۂ آہے فغانے

(اقبالؔ)

سخنہائے گفتنی

۱۹۰۳ء میں ڈاکٹر جی بی بری کے اس اعلان پر کہ تاریخ ایک سائنس ہے، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ" ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مخالفین میں ایک گروہ ان سائنس دانوں کا تھا جو مادی دنیا کے مختلف مظاہر کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کو تاریخ کا درجہ دینا مہمل بات ہے کیونکہ تاریخ میں تواتر شاہدہ اور غیر متبدل ماحول کا مہیا ہونا ممکن نہیں۔ دوسرا گروہ ان ادیبوں کا تھا جو یہ کہتے تھے کہ تاریخ "سائنس ہو یا نہ ہو ایک "فن" یا "ادب" ضرور ہے سائنس تاریخ کا بے جان ڈھانچہ تو یقیناً فراہم کر سکتی ہے لیکن اس میں زندگی کی روح پھونکنے کے لیے شاعرانہ تخیل درکار ہے۔

یہ غلط فہمیاں اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ تاریخ کا مفہوم مختلف وقتوں میں مختلف سمجھا گیا۔ کچھ لوگ واقعات کو جو ظہور پذیر ہوتے ہیں "تاریخ" کہتے ہیں۔ بعض لوگ "واقعات کے دھارے" کو تاریخ کہتے ہیں لیکن تاریخ کے اصلی معنی تحقیق و جستجو کے ہیں یا تاریخ سے مراد وہ علم ہے جسے تحقیق و جستجو کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ حقائق کی صداقت کا پتہ لگانے اور اس تک پہونچنے کی مسلسل اور انتھک جد و جہد کو "تاریخ" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس علم کی بنیاد تنقید ہے اور تاریخ "تنقیدی سائنس" ہے۔ حقائق کو تحقیق و جستجو اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ایک چیز ہے اور ان نتائج کو کس طرح لکھا اور بیان کیا جائے یا دوسروں کے سامنے پیش کیا جائے

دوسری چیز ہے۔ موخر الذکر صورت میں تاریخ ایک فن ہے اور ایک مورخ کا ادیب اور فنکار ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ محقق اور پارکھ ــــ کوئی بھی شخص اس وقت تک ایک کامیاب مورخ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے اندر ایک سائنسداں کی بے تعلق (detached) حق پرستی اور شاعرانہ بلند پردازی نہ رکھتا ہو۔

بد قسمتی سے قرون وسطیٰ میں (علامہ ابن خلدون کو مستثنیٰ کر کے) محض واقعات کے قلم بند کرنے کو عموماً تاریخ کے مترادف سمجھا گیا۔ جہاں تک عینی مشاہدہ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کا تعلق تھا، یہ طریقہ پھر بھی غنیمت تھا لیکن رفتہ رفتہ لوگ گزشتہ واقعات کو تاریخ کے نام پر بلا سوچے سمجھے اور بغیر چھان بین کئے، نقل کرنے لگے۔ یہ وبا عربی اور فارسی داں طبقہ میں بھی پھیلتی گئی بعد ازاں اردو داں طبقہ بھی اسی روش پر چل پڑا۔

میرا تعلق اسلامی اور ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ سے ہے۔ اکثر اردو میں لکھی ہوئی "تاریخی" کتابیں نظر سے گزرتی ہیں۔ جو حضرات اردو میں تاریخی کتابیں لکھتے ہیں عام طور پر پایا گیا ہے کہ وہ عربی فارسی کے اچھے عالم یا کم از کم ان زبانوں میں اچھی استعداد رکھتے ہیں۔ ان قلمی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں تک، جو اسلامی یا ہندی عہد وسطیٰ کی تاریخ کے اصل ماخذ ہیں، ان کی رسائی ہے۔ وہ تراجم کے محتاج نہیں لیکن جب بے پروائی سے یہ کتابیں لکھی جاتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ، تاریخ نہیں رہتی بلکہ وہ واقعات کی کھتونی یا ایک جانبدار وکیل کی بحث بن جاتی ہے۔ بے لاگ تنقیدی شعور کا عموماً فقدان ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صرف زندہ افراد اور جماعتوں کا ہی احتساب ضروری نہیں بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ قومی، ملکی اور ملی روایات کا احتساب بھی ناگزیر ہے اور اسی صورت میں حال کی روشنی میں ماضی کو اور ماضی کی روشنی میں حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور ایک تابناک مستقبل کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ اس کام

حرف بے لاگ مورخ ہی انجام دے سکتا ہے۔ کسی جانبدار وکیل سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی وہ ہمیں ماضی کے سنہرے خواب دکھا کر خود فریبی اور غلط پندار میں تو مبتلا کر سکتا ہے لیکن صحیح رہنمائی نہیں کر سکتا

میرے بزرگ اور کرم فرما پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے مجھے ترغیب دی کہ میں اردو میں بھی کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ اس ترغیب کا نتیجہ "تاریخی جائزے" کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ اس مجموعہ میں کل اٹھارہ مضامین ہیں۔ "عمر خیام کا نظریہ حیات" اور "چینی ظروف سازی کی چینی صنعت" کو چھوڑ کر بقیہ سولہ مضامین ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ہندی قرون وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ میں نے ان مضامین میں اپنے نقطۂ نظر کو غیر جانبدارانہ طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور حتی الامکان خواہ مخواہ کی "وکالت" سے اپنا دامن بچایا ہے۔ میں کہاں تک اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکا ہوں یہ فیصلہ کرنا اہل نظر کا کام ہے۔

"عمر خیام کا نظریہ حیات" اور "چینی ظروف سازی کی چینی صنعت" کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہیں۔ موخر الذکر سے اجمالی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ چینی کے برتن جن کا استعمال آج اتنا عام ہے، پہلے پہل کب اور کہاں بننا شروع ہوئے، اور یہ چینی صناع ان کے نقش و نگار اور آرائش و زیبائش میں اپنی ذہنی صلاحیتوں اور چابکدستی کو کس طرح اجاگر کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اسلامی یا ہندی فن ظروف سازی کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون ان کے لیے پس منظر کا کام دے سکے۔ عمر خیام کا مطالعہ یہ سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے کہ گیارھویں بارھویں صدی عیسوی کی اسلامی دنیا میں بھی جب کہ مذہب کی گرفت دل و دماغ پر مضبوط تھی، مدرسوں اور خانقاہوں کی کمی نہ تھی، مسلم حکومتیں بھی موجود تھیں اور خلافت اسلامیہ کا بھرم بھی قائم تھا، عمر خیام جیسے ایک مسلمان فلسفی اور شاعر کو "تلاش حق" میں کن کن کٹھن منزلوں سے

گزرنا پڑا۔ غالبؔ "بادہ و ساغر" کہہ کر کام چلا لیتے ہیں لیکن عمر خیام "فکر و نظر" کی ان گھاٹیوں سے بھی گزرتا ہے جہاں "بادہ و ساغر" سے بھی کام نہیں چلتا۔ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے ذہنی و فکری آزادی پر عام پابندی عہد وسطیٰ کی اہم خصوصیت بھی۔

مجھے مسعود صاحب کا شکریہ اس لیے بھی ادا کرنا ہے کہ انھوں نے از راہ کرم "تعارف" لکھ کر میری عزت افزائی فرمائی۔

اپنے شاگرد عبدالحلیم خاں کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے تعاون سے یہ کتاب مکمل ہو سکی۔

میرے دوسرے شاگرد سخاوت علی صدیقی اگر نہ ہوتے تو شاید یہ کتاب منظر عام پر آ ہی نہ سکتی۔ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ کی جملہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ شکریہ کے الفاظ سے ان کے خلوص اور انہماک کا اظہار ممکن نہیں۔

ممتاز ہائر سکنڈری اسکول کے محمد شریف الحسن صاحب کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کا پروف پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔

پروفیسر سید احتشام حسین رضوی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، سید امیر حسن نورانی، سید صباح الدین عمر، شفاعت علی صدیقی اور شیخ ممتاز حسین جونپوری کے تعاون اور مفید مشوروں سے مجھے بہت مدد ملی ہے۔ ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ادب نواز مولوی محمد حسین صاحب شمس قاسمی کا کوروی مالک ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ہنسی خوشی اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا بار اٹھایا۔

محمد یٰسین

کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ

۷ نومبر ۱۹۶۲ء

ابوالفضل

اکبر اعظم کے دربار کے نورتنوں میں انمول رتن، شہنشاہ کا دوست، غمگسار، مشیر اور عہد اکبری کا مورخ ابوالفضل ہر ذوی علم اور ہر انسان سے نہ صرف ہمدردی بلکہ خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

پیدائش، خاندانی حالات اور ابتدائی زندگی:

ابوالفضل ۱۴ر جولائی ۱۵۵۱ء کو آگرہ میں پیدا ہوا۔ والد ماجد شیخ مبارک علم دوست اور آزاد خیال بزرگ تھے۔ ابوالفضل اپنے بڑے بھائی فیضی سے چار سال چھوٹا تھا۔ ابوالفضل نے تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ وہی اس کے پہلے اور آخری استاد تھے۔ اس کے ہم سبقوں میں فیضی اور ملا عبدالقادر بدایونی قابل ذکر ہیں۔ ابوالفضل اور بدایونی جو دو متضاد مکتب خیال کی نمائندگی کرتے ہیں شروع میں دوست اور ہم مکتب تھے۔

شیخ مبارک کسی حد تک مہدوی خیالات اور تحریک سے متاثر تھے۔ کٹھ ملاؤں سے انھیں نفرت تھی۔ یہ آزاد خیالی اور وسیع النظری ابوالفضل کو باپ سے ورثہ میں ملی۔ شیخ مبارک

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کی سازشوں کے شکار ہوئے۔ ان پر مغرک اور بے دین ہونے کا الزام لگایا گیا۔ شیخ مبارک مسلمان تھے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں تنگ نظری اور تعصب سے وہ کوسوں دور تھے، درباری ملا گروپ ایسے آزاد منش انسان اور اس کی ترقی اور مقبولیت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا شیخ مبارک کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں ان کا گہرا اثر ابو الفضل پر ایام طفولیت میں پڑا۔ ان تلخیوں نے امٹ نقش چھوڑا اور مستقبل کی داغ بیل انھیں حالات میں پڑی۔ ابو الفضل مذہب کی آڑ میں حرص کے بندے اور اقتدار کے خواہاں مذہب کے علمبرداروں سے نہ صرف بدظن بلکہ باغی ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ مذہبی اجارہ داروں کا جواب انھیں کے الفاظ میں دے گا اور ہمہ تن حصول علم میں منہمک ہو گیا۔ اس نے خصوصاً عربی، فقہ، منطق، فلسفہ اور تاریخ پر اپنی توجہ مرکوز کی ابھی وہ پندرہ سال کی عمر تک بھی نہ پہنچا تھا کہ تعلیم سے فراغت حاصل کر لی اس کے علم اور لیاقت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔

انیس۱۹ سال کی عمر سے ابو الفضل نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور عزلت نشینی کی زندگی کو اپنا شعار بنایا۔ ابو الفضل خود کہتا ہے کہ اس کے گوشہ گرد کی موجودگی سے اسے اپنی علمی استعداد پر فخر محسوس ہوتا تھا۔ ایک استاد کی حیثیت سے بھی ابو الفضل نے جلد ہی اپنا سکہ جما لیا۔

دربار اکبری میں

۱۵۷۴ء میں جب وہ تیس سال کا تھا، پہلی بار اس کا تعارف اکبر سے آگرہ میں فیضی کے بھائی کی حیثیت سے کرایا گیا۔ اس ملاقات نے ابو الفضل کی کایا

ہی پلٹ دی۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ شہنشاہ کو دیکھتے ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ گوشہ نشینی کی زندگی ترک کر دے گا اور اس کی مذہبی تحقیق و جستجو اور تشنگی کو سیراب کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے گا۔ اس موقع پر ابوالفضل نے تحفۂ شہنشاہ کی خدمت میں آیتہ الکرسی کی تفسیر پیش کی۔ ملا بدایونی کہتے ہیں کہ یہ تفسیر شیخ مبارک کی لکھی ہوئی تھی لیکن بدایونی کا یہ قول صحیح نہیں ہے جب داؤد خاں کرانی حاکم بنگال کی شکست کے بعد اکبر آگرہ واپس ہوا تو ابوالفضل نے سورۃ "الفتح" کی تفسیر پیش کی۔

"عبادت خانہ" کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اور ابوالفضل اس کے جلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ کچھ اس طرح واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ وہ رفتہ رفتہ عبادت خانے میں کٹھ ملاؤں کی حزب مخالف کا لیڈر بن گیا۔ دربار کے مذہبی گروپ کی قیادت مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب پہلی بار مخدوم الملک نے ابوالفضل کو دیکھا تو یاس کے عالم میں چیخ اٹھے: "کون سا مذہبی فتنہ ایسا ہے جس کا یہ شخص (ابوالفضل) اہل نہیں ہے"۔

حالات ابوالفضل کیلئے سازگار ہوگئے اور ملا گروپ کو شکست پر شکست ہوتی گئی۔ شیخ مبارک کے انتقام کی آگ بجھی۔ ابوالفضل غیر متعصب، فراخ دل اور روشن خیال مسلمان تھا، مذہبی اختلافات، اور کج بحثیوں سے بالاتر تھا محبت خلوص اور بھائی چارہ سے وہ راہ معرفت طے کرنا چاہتا تھا جب اکبر نے جبہ و دستار کا دامن تار تار پایا تو وہ بھی تنگ نظری سے دور ہوتا گیا۔ وہ اسلام جسے ملاؤں نے اکبر کے سامنے رکھا، جس میں رواداری، صلح کل، امن و آشتی اور مصالح امور مملکت کی گنجائش اور رعایت نہ تھی، جو حکومت کی حکمت عملی، تدبر اور ہندستانی

قومیت کے ارتقا کے منافی تھا شہنشاہ کے دل کو نہ موہ سکا۔ اکبر نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اکبر کو اس اسلام کی جستجو تھی جس میں عالمگیر اخوت اور مساوات کا پیغام تھا۔ اکبر اَن پڑھ تھا۔ اسلام کے اصل سرچشمہ تک براہ راست اس کی رسائی نہ تھی۔ دل میں تلاش حق کی سچی لگن تھی لیکن درباری ملّاؤں سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔ دربار شاہی میں ابوالفضل کی آمد اکبر کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ ابوالفضل کے متبحر علمی، گہرے سیاسی شعور، بے تعصبی، اور مذہبی صلح کل کے نظریہ سے شہنشاہ کو بہت بڑا سہارا ملا۔ مذہبی فسبدہ بانہ دل کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور امن و آشتی و صلح کل کے راستہ کا سنگ گراں ہٹ گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر راہ اعتدال سے بھٹک گیا اور اس سے ایسی باتیں بھی ظہور میں آئیں جن کا استحکام سلطنت اور ہندوستانی قومیت کے ارتقاء سے کوئی علاقہ نہ تھا لیکن اکبر کی ان بے اعتدالیوں کی ذمہ داری ابوالفضل پر ڈالنا زیادتی ہوگی۔ اسی طرح اکبر پر الحاد اور بے دینی کا الزام عاید کرنا بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ اگر ہم اس کے جانشین شہنشاہ جہانگیر اور ہم عصر عیسائی پادریوں کی شہادت پر اعتماد کر سکتے ہیں تو ہمیں کم از کم اتنا تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اکبر کا خاتمہ اسلام پر ہوا۔

ابوالفضل علمی اور ادبی مشاغل سے بھی غافل نہیں رہا۔ اسی اثنا میں اس نے سنسکرت کتاب "پنچ تنتر" کا کلیلہ ودمنہ کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

"بھگوت گیتا" کے اس باب کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا جس میں ارجن اور دریودھن کی جنگ کا تذکرہ ہے۔

۱۵۸۲ء میں "دین الٰہی" کا اعلان ہوا۔ ابوالفضل اب اکبر کے دل و دماغ پر

حاوی ہو چکا تھا۔ وہ شہنشاہ کا نفس ناطقہ اور اس کے دین الٰہی کا مبلغ تھا اور روحانیت و معرفت کے جادہ کا ہم سفر بھی۔

ملا عبدالقادر بدایونی کا یہ الزام کہ ابوالفضل نے یہ سب کچھ زر و مال اور شہرت و اعزاز کی خاطر کیا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیس سال تک اکبر کی خدمت کرنے کے بعد بھی ۱۵۹۶ء میں صرف وہ دو ہزار پنجصدی کے منصب پر مامور تھا۔

قلم سے شمشیر و سناں تک:

۱۵۹۷ء میں اکبر نے ابوالفضل کو دکن کی سرکوبی کے لیے منتخب کیا۔ دکن کی مہم میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی اور مغلیہ آن بان کو سخت دھکا پہنچ چکا تھا۔ ناکامی کی وجہ عبدالرحیم خان خاناں اور شہزادہ مراد کے باہمی اختلافات تھے خاندیس کے فاروقی حکمراں بہادر خاں کو اکبر نے حکم دیا تھا کہ دکن میں مغل فوج کی ہر ممکن اعانت کرے۔ جب ابوالفضل دکن پہنچا تو بہادر خاں نے کثیر رقم رشوت کے طور پر ابوالفضل کو پیش کی تاکہ اسے مہم میں شرکت پر مجبور نہ کیا جائے۔ ابوالفضل نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور واقعات کی تفصیلی اطلاع شہنشاہ کو بھیج دی۔

ابوالفضل نے دکن کے معاملات کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا اور مغلیہ وقار کو اونچا اٹھایا۔ دکن کی فتوحات کے بعد ابوالفضل اکبر کی سرکردگی میں اسیرگڑھ گیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ ابوالفضل نہ صرف قلم کا بادشاہ بلکہ تلوار کا دھنی اور میدان سپاہ کا بھی سورما تھا۔

فتح اسیرگڑھ کے بعد ابوالفضل پھر عازم دکن ہوا۔ اس مرتبہ اسے زیادہ

پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عبدالرحیم خان خاناں اور شہزادہ دانیال نہ صرف یہ کہ باہمی رقابت اور حسد کے شکار تھے بلکہ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ابوالفضل کو اکبر کا جاسوس سمجھ کر اس سے نفرت کرتے تھے۔ مغلیہ مفاد کی کسی کو فکر نہ تھی دونوں نے مل کر ابوالفضل کی کوششوں کو بار آور نہ ہونے دیا۔ دکنی باغیوں کی سرکوبی کے لیے ان دونوں نے موثر اقدام کرنے سے گریز کیا۔ مجبوراً ابوالفضل کو خود باگ ڈور سنبھالنی پڑی اور اس نے خود باغیوں کے خلاف کارروائی کی۔ احمد نگر کے والی ریاست کو شکست ہوئی اور مغل اقتدار دکن میں قائم ہو سکا۔

یہی وہ وقت تھا جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور الہ آباد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اکبر نے ابوالفضل کی کمی شدت سے محسوس کی اس نے ابوالفضل کو جلد از جلد آگرہ پہونچنے کے احکام صادر کئے۔ ابوالفضل نہایت سرعت سے دربار روانہ ہوا لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کہ وہ اپنے آقا کے حضور میں حاضری دے سکے۔ راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ نے نروار کے قریب بار کے مقام پر ۱۲ اگست ۱۶۰۲ء کو ابوالفضل کی شمع حیات گل کر دی۔

ابوالفضل کا قتل شہزادہ سلیم کے ایما سے ہوا۔ اور یہ شہزادہ کے ماتھے پر کلنک ہے کیونکہ باپ بیٹے کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان کا ذمہ دار ابوالفضل کسی طرح نہ تھا۔

ابوالفضل کی موت کا جتنا صدمہ اکبر کو ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے اکبر کو کبھی بھی اتنا غمناک اور ملول نہ دیکھا تھا جتنا کہ ابوالفضل کی موت پر۔

ابو الفضل ایک انسان کی حیثیت سے:

"مآثر الامراء" کے مصنف شاہ نواز خاں کہتے ہیں کہ حالانکہ کچھ لوگوں نے ابو الفضل کو دہریہ، اسلام دشمن اور اکبر کے عہد میں اسلام کی تباہی کا ذمہ دار کہا ہے لیکن اصل واقعہ اس کے برعکس ہے۔ وہ وحدت الوجود کا پیرو اور مبلغ تھا اور تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے کوسوں دور۔ ابو الفضل نے جو کچھ کیا یا جو کچھ کہا اور لکھا اس میں ہمیں انسانیت کی جھلک ملتی ہے۔ وہ حساس دل و دماغ کا مالک تھا اس نے کبھی بھی اپنے کسی خادم کو گھر سے نہ نکالا باوجودیکہ وہ کام کرنے کے لائق نہ رہ گئے تھے، ابو الفضل جتنی محبت کرتا تھا، اس میں جتنی وسیع النظری تھی ویسی ہی اس کی خوراک بھی تھی دن میں دس سیر کی مقدار خوراک اس کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی۔

مورخ کے روپ میں:

اگر یہ کہا جائے کہ البیرونی کے بعد ابو الفضل قدیم ہندوستان اور قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا مورخ ہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی شہنشاہ اکبر سے عظیم تر نہیں گزرا ہے اور نہ کوئی تاریخ اکبر نامہ سے افضل تر ہے۔ در اصل اکبر نامہ فن تاریخ، سیاست اور ملک داری میں ایک نئے انقلاب کا بانی ہے۔

سر ہنری ایلیٹ "تاریخ ہندوستان" کے مولف نے ابو الفضل کے اکبر نامہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ ان کی تقلید الفنسٹن اور مارلے نے کی جنھوں نے ابو الفضل کی تصانیف کو کمتر قرار دیا ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ابو الفضل لفاظ اور خوشامدی تھا اس نے جا و بیجا اکبر کی حمایت کی ہے انھوں نے ابو الفضل کو واقعات کے چھپانے یا ان کے توڑنے مروڑنے کا ملزم گردانا ہے۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہے اکبر نامہ اور آئین اکبری کے مطالعہ سے پہلے اس زمانہ کا انداز تحریر اور اسلوب بیان کا ذہن نشین ہونا ضروری ہے۔ پروفیسر بلاک مین نے صحیح کہا ہے کہ نہ صرف فارسی زبان بلکہ ابو الفضل کے انفرادی طرز تحریر سے مانوس ہوئے بغیر ابو الفضل کی تصنیفات کا صحیح حظ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے حالانکہ شاہ نواز خاں کا قول ہے کہ ابو الفضل کا انداز شاندار ہے اور دوسرے مصنفوں کی غیر ضروری باریکیوں سے معرا اور پاک ہے۔ میجر پرائس کی اس رائے میں بہت وزن اور صداقت ہے کہ ابو الفضل خوشامدی نہیں بلکہ مداح تھا اور اس کی مداحی درجہ عبودیت اور پرستاری کو پہنچ چکی تھی وہ ہیرو ورشپر تھا۔ لیکن قرون وسطیٰ نے اکبر سے بہتر ہیرو بھی نہیں پیدا کیا جس کی پوجا کی جاسکے۔

ابو الفضل پر اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کی اہم خصوصیت مبالغہ اور قصیدہ خوانی ہے ابو الفضل شہنشاہ کو وقت کے مروجہ عقیدہ کی نسبت سے خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ مانتا تھا اس کے اقوال، احکام اور افعال میں لغزش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لہذا ابو الفضل نے بھی اکبر کے خیالات اور کارناموں کو صحیح اور غلطیوں سے مبرا سمجھا اور اس کی تائید اور تعریف کی۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ ابو الفضل نے کسی واقعہ کو چھپایا نہیں۔ ہاں اس نے اسے اپنے خاص رنگ میں لکھا ہے۔ لیکن واقعہ کا ذکر موجود ہے اب یہ کام نقادوں اور محققین کا ہے کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کریں مثال کے طور پر اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف عام ہیجان تھا۔ کسی بھی ہمعصر مورخ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے یہاں تک کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ بھی خاموش ہے۔ لیکن ابو الفضل اس عام شورش

کو یوں ظاہر کرتا ہے کہ عوام الناس کی کم عقلی اور پاگل پن تو دیکھئے کہ ہر گلی کوچہ میں ظل اللہ کے مذہبی خیالات کے بارے میں رائے زنی کرتے ہیں اور طوفان برپا کر رکھا ہے جو بالکل نامناسب اور غلط ہے۔ پروفیسر بلاک مین کی یہ رائے مناسب ہے کہ اکبر نامہ اور آئین اکبری کے مطالعہ کے بعد ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابو الفضل نے کچھ بھی نہیں چھپایا اب یہ قارئین کا فرض ہے کہ وہ سطروں کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ سطروں کے درمیان جو کچھ ہے اسے بھی نظر انداز نہ کریں۔ اکبر نامہ میں اگر درباری جملوں کو الگ کر دیا جائے تو عہد اکبری کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ہے۔

ابو الفضل کے اثرات

پروفیسر دھیلر کا قول ہے کہ اکبر کی فوق البشریت کا احاطہ کرنا اس وقت تک مشکل ہے جب تک ہم دھیان نہ رکھیں کہ یہ نتیجہ ہے ابو الفضل کی کاوشوں کا ——
اور اسی طرح ابو الفضل کی صلاحیتوں کو سمجھنا ناممکن ہے جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اکبر کی انانیت اور غرور کی تسکین کی سعی کر رہا ہے۔ پروفیسر بلاک مین کا خیال ہے کہ ابو الفضل اپنے زمانہ پر براہ راست اثر انداز ہوا۔ اکبر کے خیالات کو ابو الفضل نے فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ابو الفضل اکبر کی کٹر اسلام سے برگشتگی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ابو الفضل کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی جب عبد اللہ ازبیک والی توران نے یہ کہا کہ وہ اکبر کی تلوار سے زیادہ ابو الفضل کے قلم کی ہلکی سی جنبش سے خوف کھاتا ہے۔

اکبرانی تعمیرات کے آئینے میں

فن تعمیر بذات خود ایک جاندار فن ہے اس لیے کہ اس کی ایک انفرادی نفسیات اور ایک الگ مزاج ہوتا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ نت نئے سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے یہ فن اپنے خالق کی ذہنی کیفیات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ تاریخ کا یہ اصول ہے کہ وہی قوم پنپ سکتی ہے جس کی تہذیب اور معاشرہ میں قوت نمو پیدا ہو چکی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اقوام کا عروج و زوال ان کی تہذیبی قوتوں پر منحصر رہا ہے۔ لیکن کوئی بھی معاشرتی اور ثقافتی تحریک کسی خاص مزاج اور نفسیات کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح سے فن تعمیر بھی اپنا کوئی نادر روزگار نمونہ اس وقت تک پیش نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی تخلیقی شعور کارفرما نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ دربار سے منسلک سوانح نگار روایتی قصیدہ گو کے مانند اپنے محسن کی کمزوریوں کو چھپالے جائے یا اس کے اوصاف بڑھا چڑھا کر پیش کرے۔ لیکن اپنے ممدوح کی بنوائی عمارتوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی اس لیے کہ عمارتیں اپنے خالق کے ذوق ذہنی اپج اور نفسیاتی کیفیات

کو من و حسن پیش کرتی ہیں یہی نہیں بلکہ گذرے زمانے کی تعمیراتی باقیات اپنے زمانے کے مزاج اور شعوری و تہذیبی تحریک کی گواہ بھی ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک انقلاب کا نقیب تھی۔ اس کی آمد کے بعد ہندوستان میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا، ہمارا دیس ہندو دھرم اور اسلام کے دو تیز دھاروں کا حسین سنگم بنا اور ہماری تہذیب رنگارنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن گئی۔ دو تہذیبوں کے اس اشتراک نے فن تعمیر کی تاریخ میں بھی ایک نئے دور کا آغاز کیا اور ہندو مسلم طرز تعمیر کی آمیزش سے اس نئے اسلوب کی بنا پڑی جسے ہم ہندوستان کا ہندو مسلم فن تعمیر کہتے ہیں۔

ہندو مسلم طرز تعمیر نے اس وقت جنم لیا جب مسلمانوں کو سیاسی طور پر دلی اجمیر اور قنوج کی حکومتوں پر غلبہ حاصل ہو چکا تھا اور ۱۱۹۳ء سے لے کر ۱۲۰۶ء تک پورا شمالی ہند ان کے زیر نگیں آگیا تھا۔ دلی کی راج دھانی کے کھنڈروں پر ایک نئے دار السلطنت کی بنا پڑ رہی تھی جس میں نئے نئے محل تھے، مسجدیں تھیں اور مینارے تھے۔ ان سب کی تعمیر میں ہندو کاریگروں کا بھی ہاتھ تھا مگر انداز دوسرا ہو گیا تھا اس کے نتیجے میں جو نیا اسلوب معرض وجود میں آیا اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے خدوخال نمایاں تھے۔ جہاں تک عمارتوں کے ڈھانچوں، ان کی آرائش و زیبائش اور چھتوں کی ساخت کا تعلق تھا ہندو مسلم طرز تعمیر نے مسلمانوں کے اصولوں کو اپنا یا اور باقی جیسے کا تیسا رہا۔

ہندو مسلم طرز تعمیر ایک علٰحدہ طرز ہے یا نہیں، اس کے بارے میں ماہرین بالکل الگ الگ رائے رکھتے ہیں۔ ہیول HAVELL کے نزدیک ہندو مسلم طرز تعمیر کوئی

نیا اسلوب نہیں بلکہ نو وارد جو کچھ بھی اپنے ساتھ لائے وہ محض ایک لوٹنے والی لہر ہے، جو ہندوستان کے حدود کے باہر بدھ دھرم کے ساتھ ساتھ گئی تھی، اس کے خیال میں ان نئے عناصر میں جنھیں ہندو مسلم طرز سے تعبیر کیا جاتا ہے تخلیقی صلاحیت قطعی نہیں تھی اور اسی لیے ہندوستان کے مروجہ اور قدیم فن تعمیر نے ان عناصر کو اپنے میں ضم کر لیا۔ ہیول کی یہ رائے حقیقت پر مبنی نہیں کیوں کہ بارھویں صدی تک وسط ایشیا، ایران، اور دوسری اسلامی سلطنتوں میں مسلم طرز تعمیر کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی بلکہ ہندوستان میں آنے سے قبل یہ مسلم طرز ایک مکمل اور جامع طرز بن چکا تھا مسلم سلاطین کو تعمیرات سے فطری لگاؤ تھا اور اس کی گواہ بغداد، قرطبہ، قاہرہ، قسطنطنیہ اور دمشق کی پرشکوہ مسجدیں ہیں جن کی نکیلی محرابیں، سر بہ فلک منارے اور سجل گنبد ایک انفرادی خصوصیت رکھتے ہیں۔ انھیں عناصر سے ہندوستان میں ہندو مسلم طرز تعمیر کا آغاز ہوا۔

ہندوستان میں دور سلاطین اور اس کے بعد صوبائی طرز کی عمارات جو تغلقوں کے زوال کے بعد کی پیداوار ہیں کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا مناسب ہوگا کہ اس دور کی تعمیرات میں مسلم طرز تعمیر غالب ہے اور ہندو اثرات بس کہیں کہیں ملتے ہیں۔

شیر شاہ وہ ہستی ہے جس نے ہندو مسلم فن تعمیر کے نئے اسلوب کو ایک ٹھوس بنیاد بخشی اور ہندوستان کے فن تعمیر کو ایک نئے اور روشن مستقبل کی طرف موڑ دیا۔ شیر شاہ کے چند روزہ دور حکومت کو بجا طور پر فن تعمیر کا نشاۃ ثانیہ کہا جا سکتا ہے۔ سوری دور کی جملہ عمارتیں حقیقی معنوں میں ہندوستان کے قومی

طرز کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔ سوری عہد کی تاریخی حیثیت اس حسین سنگم کے مانند ہے جہاں دو الگ الگ دھارے یعنی ہندو اور اسلامی تہذیب اور معاشرت ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے اور انجام کار ایک نئی ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا تھا۔ شیر شاہ کے زمانے میں مسلم اقتدار کی حیثیت غیر ملکی نہ رہ گئی تھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے وہ مشترکہ تہذیب وجود میں آنے لگی تھی جس کی تکمیل اکبر اعظم کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ یہ ابھرتی ہوئی مشترکہ تہذیب سوری عمارات کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ شیر شاہ کی تعمیر کردہ دلی میں مسجد قلعہ کہنہ کے بارے میں فرگوسن FERGUSSON کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "یہ مسجد خارجی طور پر مسلم طرز کی ہے مگر داخلی اعتبار سے یکسر ہندو اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کے باوجود مسلم روایات اور قوانین سے اس میں ذرا بھی انحراف نہیں پایا جاتا" مسجد قلعہ کہنہ کی تعمیر دراصل اس عظیم تبدیلی کی نشان دہی کرتی ہے جو اس وقت ہندوستان کے مزاج میں رونما ہو گیا تھا یعنی کل کے کل مسلم عناصر اور روایات جو ابھی تک غیر ملکی حیثیت رکھتے تھے، ایک نئے سانچے میں ڈھل کر ہندوستانی بن گئے۔

وی۔ اے۔ اسمتھ V.A.SMITH نے "ہندوستان اور سیلون کے فنونِ لطیفہ کی تاریخ" میں صحیح لکھا ہے کہ اسلامی فنون اور طرزِ تعمیر کے خط و خال تمام اسلامی ملکوں میں تقریباً یکساں ہیں اس لیے کہ اسلامی فنون اور تہذیب کا سرچشمہ بذاتِ خود مذہب اسلام ہے۔ لیکن اس دور میں جب کہ مذہب انسان کی زندگی کے انگ انگ میں چھایا ہوا تھا ایک پیغامبر آیا۔ اس نے ہندوستان کے

سبھی مذاہب کو ساتھ ساتھ زندہ رہنے کا سبق دیا۔ رواداری کا یہ پتلا اور ہندوستانی قومیت کا امام' اکبر اعظم تھا؟

اکبر کے دورِ حکومت کے اولین برسوں میں ہمایوں کا مقبرہ تیار ہوا جس کو ہمایوں کی بیوہ نے بنوایا تھا۔ اس مقبرے نے فنِ تعمیر میں ایک نئی رُوح پھونکی کیوں کہ اس کی تعمیر میں نئے اصول اپنائے گئے تھے۔ بہتر امکانات اور زیادہ سے زیادہ لچک مہیا کی گئی تھی۔ لیکن اس عمارت سے اکبر کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ تو آنے والے دَور کا نقیب تھا۔ حقیقت پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہندو مسلم اتحاد اس کے نزدیک محض ایک اصولی چیز نہیں تھا بلکہ ایک مسلسل عمل تھا۔ اسی لیے اکبری دور کی عمارات کی ایک ایک اینٹ سے ملکی روایات پھوٹے پڑتے ہیں۔ اپنے خیالات اور اصولوں کو پھیلانے کے لیے اکبر نے اینٹ، پتھر اور مسالوں سے مدد لی۔ چوں کہ وہ رواداری، یکجہتی اور بھائی چارے کا ایک نیا نعرہ لے کر آیا تھا اس لیے وہ انتہائی گرم جوشی سے اس کی اشاعت میں لگ گیا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اکبری دَور میں سرزمینِ ہند سے عمارتیں یک بہ یک اُبل سی پڑیں۔ آئینِ اکبری کے مطابق قلعہ معلےٰ آگرہ کے حدود میں اکبر نے پانچ سو سے اوپر عمارتیں بنوائیں۔ اس قلعے کا نقشہ گوالیار کے مان سنگھ کے قلعے سے ملتا جلتا ہے جو سولھویں صدی کے اوائل میں تیار ہوا تھا۔ گوالیار کے قلعے کے فیل در وازے، امر سنگھ دروازے کی برجیاں، فصیل سے ملحق سربفلک محلات اور ان کی ترتیب ہی نہیں بلکہ اس راج پوتی عمارت کی حسن کاری اور دل کش نقش ونگار، جنھوں نے تقریباً چالیس سال پہلے

بابر کو مبہوت کر دیا تھا، اکبری قلعے کے لیے بہترین ماڈل بن گئے۔ آگرے کے قلعے کا جہاں گیری محل، اکبری طرز کا مرقع ہے جو تمام تر سنگ سُرخ سے بنا ہے اور جس کی بیرونی حصوں کی زیبائش سنگ مرمر سے کی گئی ہے اس کی تمام تر تعمیر شہتیر اور چھت گیری BEA M AND BRACKET کے ہندو اصول پر ہوئی ہے۔ محرابیں خال خال استعمال کی گئی ہیں اور وہ بھی آرائش کے لیے۔

اکبری دور میں لاہور کو دوسرے درجہ کے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل تھی اس لیے اکبر نے ایک قلعہ یہاں بھی بنوایا۔ اس کی تعمیر آگرے کے قلعہ کے ساتھ ہی ہوئی۔ اسی لیے یہاں کی رہائشی عمارات کے باقیات جن کی تعمیر میں جہانگیر کا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے اس طرز کا پتہ دیتے ہیں جن پر جہاں گیری محل کی تعمیر ہوئی تھی البتہ لاہور کی عمارات کے نقش و نگار کچھ زیادہ تیکھے اور گہرے ہیں اور یہاں کی حسن کاری نسبتاً زیادہ کھل کر کی گئی ہے کیوں کہ ہاتھیوں کی لڑائی اور شیروں کے شکار کے مناظر در و دیوار کی زینت ہیں اکبری تعمیرات میں الہ آباد کا قلعہ بھی شامل ہے جو اس کے تقریباً بیس سال بعد بنا ہے۔ امتداد زمانہ نے یہاں کی عمارات کو زیادہ نشانہ بنایا ہے۔ فی الوقت زنانہ محلسرا میں محض ایک بارہ دری باقی رہ گئی ہے جس سے پورے قلعہ کی تعمیراتی اور زیبائشی محاسن کا ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔

حالاں کہ آگرے، لاہور اور الہ آباد کی قلعہ بند محلسرائیں اکبر کے عمارتی منصوبے کی تین اہم کڑیاں ہیں لیکن اکبر کو اس سلسلے میں جو انفرادی حیثیت حاصل ہے وہ ان قلعوں سے نہیں بلکہ فتح پور سیکری کے اجاڑ اور ویران شہر سے

ہے جس کو اس نے آگرے سے ۲۳ میل دور جنوب مغرب کی جانب تقریباً سات میل کے احاطہ میں بسایا تھا۔ اس شہر کی منصوبہ بندی اکبر کے ذاتی اور فوجی وجوہ کی بنا پر عمل میں آئی تھی۔ مغل شہنشاہ کے لیے فتح پور سیکری بہت مبارک مقام تھا کیوں کہ یہ جگہ حضرت سلیم شاہ چشتی کی اقامت گاہ تھی جن کی دعاؤں سے مغل تخت و تاج کو وارث میسر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آگرہ میدانی شہر ہونے کی وجہ سے فوجی اعتبار سے اتنا محفوظ نہ تھا جتنا کہ سیکری جو پہاڑی پر واقع ہے۔ چوں کہ سیکری ہی سے ہو کر بھرت پور اور راجپوتانے کی بہادر اور غیور سرزمین کو راستہ جاتا تھا اس لیے وہاں سے اس علاقے پر نسبتاً آسانی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ اکبر کی فوجی صلاحیتوں اور سوجھ بوجھ سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس لیے آگرے کی جگہ فتح پور سیکری کو پایۂ تخت بنانا فوجی نقطۂ نظر سے بالکل درست تھا۔ ان وجوہات کے علاوہ اکبر چوں کہ ایک نئے زمانے کا نقیب تھا اور ہندو مسلم اتحاد پر مبنی قومی یکجہتی سے متعلق اس کے خیالات بالکل نئے اور اچھوتے تھے۔ اس لیے ان نئے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے اس کو ایک نئے پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ فتح پور سیکری نے اس کو بالکل صاف اور نئی تختی مہیا کی جہاں وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومیت سے متعلق اصول متعین کر سکتا تھا۔

کسی نے کہا ہے اور درست کہا ہے کہ "اکبری دور کے دو تاریخی کارنامے ہیں۔ اول ابوالفضل کی آئین اکبری اور دوئم فتح پور سیکری کی عمارات"۔ سیکری صحیح معنوں میں اکبر کے کردار اور اس کی شخصیت کی مکمل اور جیتی جاگتی تصویر

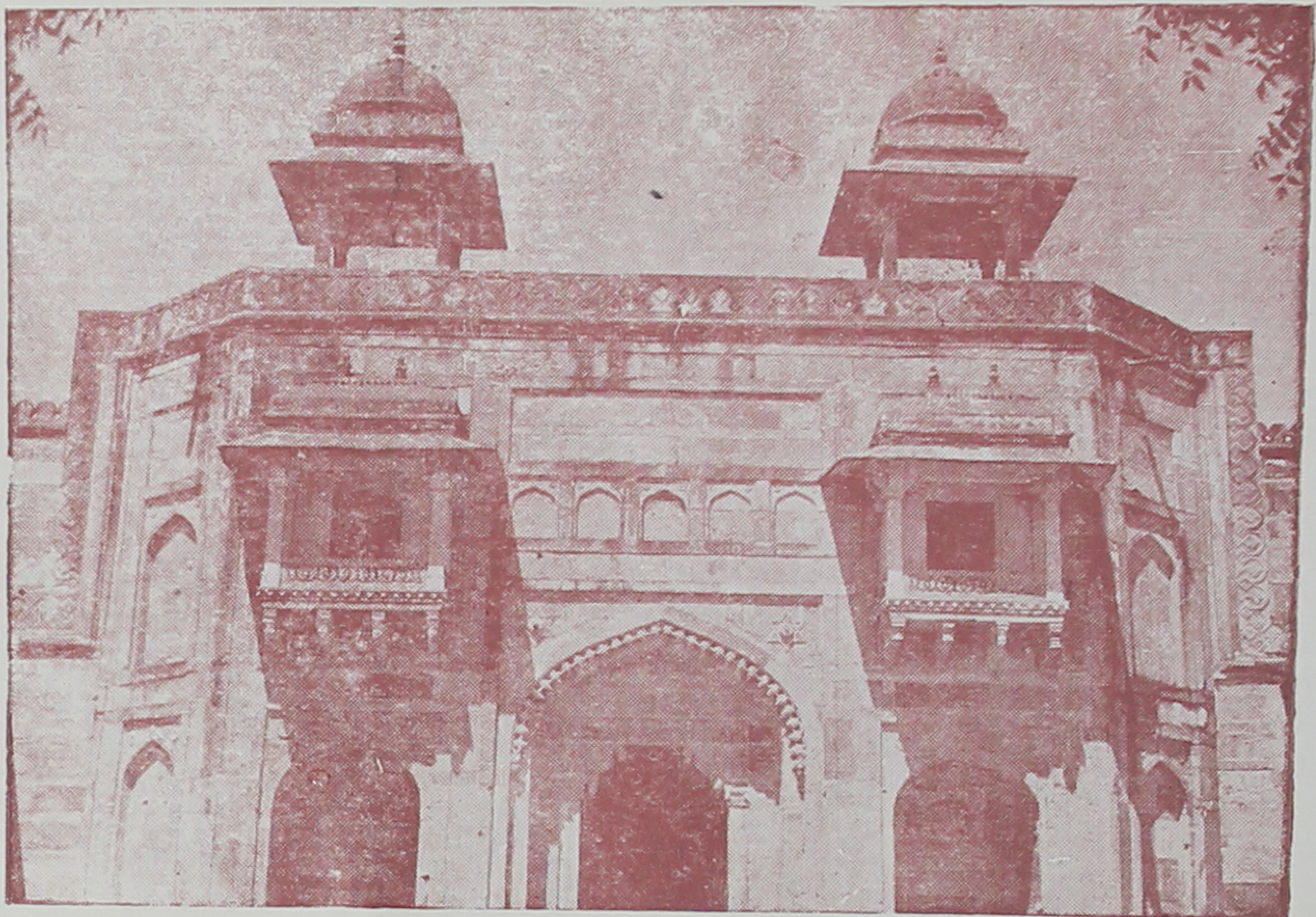
۷- یہاں کی عمارتیں جو بہ ظاہر بے زبان ہیں اکبر کی تنظیمی اور تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے حسن تدبر کی حقیقی آئینہ دار اور اُس کے ذہن اور شعور کی مظہر ہیں۔ وی۔ اے۔ اسمتھ کی سمجھ میں "سیکری کی عمارتیں ایک غیر ذمہ دار اور مطلق العنان بادشاہ کے توہم کی نشانی ہیں جس نے اپنے نیابت الہٰی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے عوام کے پیسے کو بے دریغ خرچ کیا" اسی طرح پرسی براؤن (PERCY BROWN) کا خیال ہے کہ "فتح پور سیکری کی تعمیر میں وقت بہت ہی کم خرچ ہوا کیوں کہ مزدوروں اور معماروں کی ایک بہت بڑی تعداد لگادی گئی تھی جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اسی لیے اس کے طرز میں ہندو عنصر شدید طور پر غالب ہے۔ یورپی ماہرین کی اس قسم کی دلیلیں ایک طرف ہم کو صحیح منزل کی طرف بڑھنے سے روکتی ہیں اور دوسری طرف اس عظیم آتما کی نیت پر بہت ہی ادچھے وار ہیں۔ یہ اُجاڑ اور ویران شہر در اصل اکبر کے شعور اور تدبر کی ٹھوس مثال ہے اور ابوالفضل کی اس تحریر کا کھلا ثبوت ہے کہ "جہاں پناہ کے تعمیراتی منصوبے در اصل ان کی قلبی و ذہنی کارفرمائیاں ہیں جن کو پتھر اور مسالوں کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔" غرض، فتح پور سیکری ہندوستان کی رواداری، روشن ضمیری، احیاءِ علوم اور نشاۃِ ثانیہ کی معراج ہے جو سولھویں صدی میں واقع ہوئی۔ پندرھویں صدی کے وسط ہی سے اسلام اور ہندو دھرم کی قوتیں بار بار ٹکرانے کے بعد اب ایک ایسی جگہ ڈھونڈھ رہی تھیں جو دونوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ رواداری اور مصالحت کی رَو نے اوّلاً ہندوستان کے ذہن اور خیالات پر اپنا سکہ جمایا اور پھر یہاں کی سیاست میں داخل ہوگئی۔ فتح پور سیکری در اصل ہندوستان

کی اس نفسیاتی تحریک کا نتیجہ تھی جس کی وجہ سے ایک مشترکہ تہذیب وجود میں آئی اور اکبر نے جو اس ملاپ کا محرک تھا اپنے وقت کی سیاسیات کے ساتھ ساتھ اپنے طرز تعمیر میں بھی اسی اتحاد کو اپنایا۔

فتح پور سیکری کے پیچھے محرک قوتوں کے بارے میں کہا جا چکا۔ آیئے اب یہاں کی چند عمارتوں سے پتہ لگایئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کہاں تک صداقت پائی جاتی ہے۔

۱۔ **جودھا بائی کی محل سرا**:۔ اس عمارت کو جودھا بائی سے منسوب کیا جاتا ہے حالاں کہ تاریخ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اکبر کی کوئی بھی بیوی جودھا بائی نام کی تھی۔ اس محل کی تعمیر سیکری کی دوسری عمارتوں کے بعد کی ہے گو کہ ای۔ ڈبلو۔ اسمتھ کے نزدیک یہ محل اکبر کے رہائشی محلات میں سب سے پرانا ہے۔ اس محل کا داخلہ دوسری مغل محل سراؤں جیسا روایتی ہے۔ کیوں کہ مکینوں کے پردے کا معقول خیال رکھا گیا ہے۔ پھر بھی، اس محل کی بناوٹ نہ تو خالصتاً مسلم طرز کی ہے اور نہ اس کی تعمیر میں ہندو اصول بالکل اپنا لیے گئے ہیں۔ حقیقت میں یہ عمارت اپنے دور کی صحیح ترجمان ہے اور اکبر کے ذہنی کیفیات اور کردار کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس عمارت کی وضع بہت حد تک آگرے کے جہانگیری محل کی سی ہے۔ اس محل کی چھت عدیم المثال ہے اور اسے دیکھتے ہی وہ ہماری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ یہ چھت تراشے ہوئے سُرخ پتھر کی ہے جیسا کہ موجودہ زمانے میں ٹین کا سائبان ہوتا ہے۔

۲۔ **جوگی کی چھتری**: اس عمارت کے باہر نہ جانے کیوں مدرسہ نسواں کی تختی آویزاں کر دی گئی ہے۔ اس چھوٹی سی عمارت کو انجم شناسوں کی نشست سے منسوب کیا جاتا ہے



جودھا بائی کا محل، سیکری



سنہرا مکان، سیکری

بہرحال یہ ننھی سی دل کش بارہ دری خالصتاً ہندو طرز روایات پر مبنی ہے اور گجرات کے طرز پر بنے جین مندروں کا حسین نمونہ ہے۔

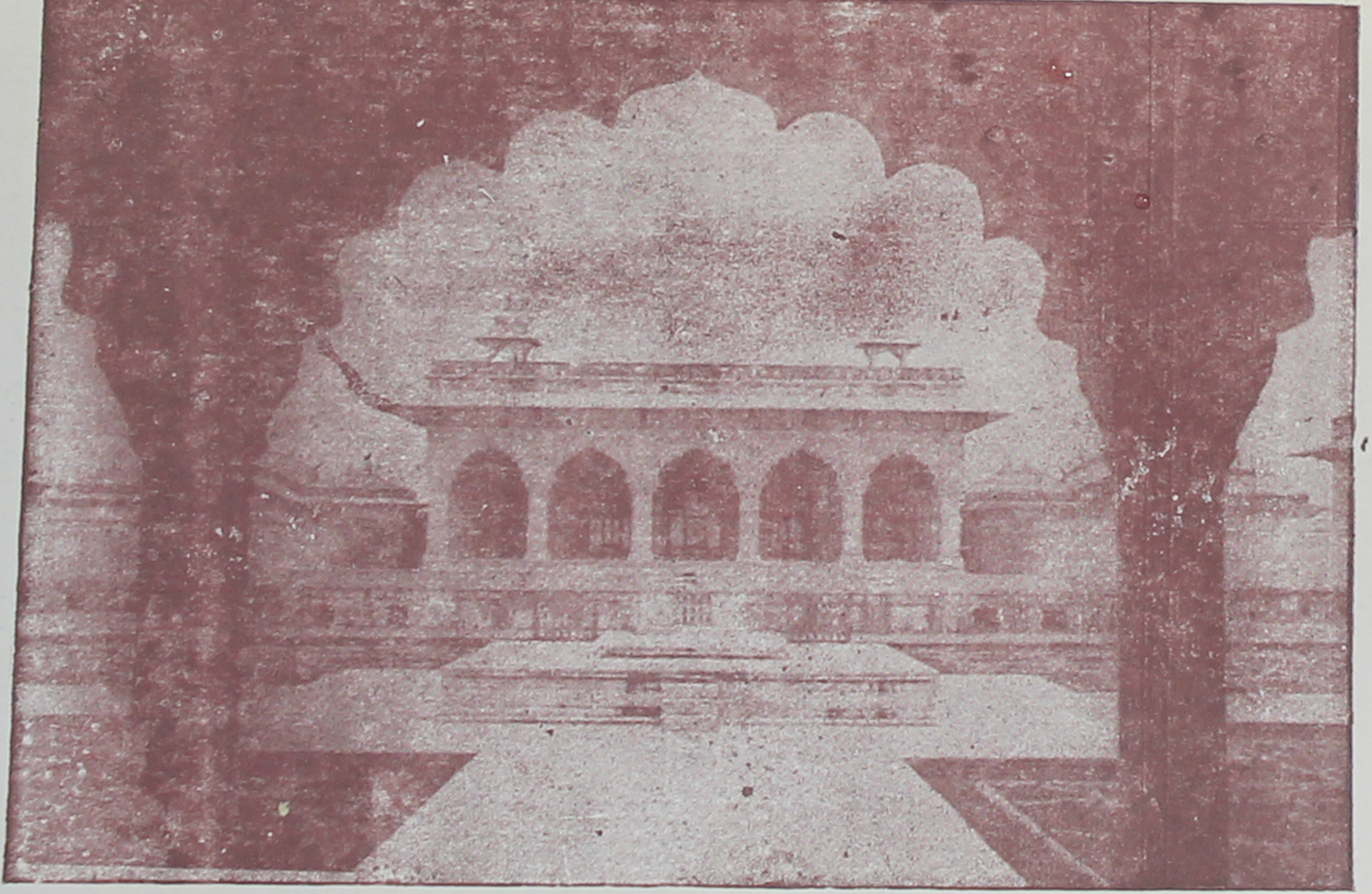
۳۔ کوٹھی بی بی مریم: اس کوٹھی کا اصلی نام سنہرا مکان ہے۔ کیوں کہ اس کے اندرونی و بیرونی دیواروں پر سنہرے پتر جڑے تھے۔ محلات خاص میں آنے والی عمارتوں میں یہ مکان سب سے بڑا ہے۔ اگرچہ ترکی سلطانہ کی محلسرا کی طرح اس میں اعلیٰ درجہ کی سنگ تراشی نہیں ہے پھر بھی اس کے اندرونی حصے کبھی اکبری دور کی فن مصوری کے نادر نمونے رہے ہوں گے جو اب مٹ گئے۔ ای۔ ڈبلو۔ اسمتھ نے اس عمارت کے اندرونی حصوں کے فوٹو چھاپے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمارت کی دیواریں کبھی تصویروں سے مزین رہی ہوں گی۔ ایک تصویر ایک گناہ گار کو دوزخ میں پھینکے جانے کا منظر پیش کرتی ہے ایک جگہ برہمن کی تصویر ہے جو اپنی دھوتی کو پیٹھ پر ڈالے ہے۔ تیسری تصویر سے ہم کو حضرت مریم (MEDONNA) کا دھوکا ہوتا ہے۔ بہت سے مورخین اس تصویر کو عیسائی مذہب کی روایت "اعلان جبریل" (ANNUNCIATION) پر مبنی بتاتے ہیں۔ لیکن اس مرقعے کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا گیا ہے کہ اس میں جو پردار شبیہیں دکھائی گئی ہیں وہ ایرانی دیومالا پر مبنی فرشتوں جیسی ہیں۔ بہرحال اس تصویر کی وجہ سے اس مکان کے مکینوں کے بارے میں بڑا اختلاف آرہا ہے۔ خیر، حقیقت کچھ بھی ہو سنہرے مکان کی تصویریں اگر ایک طرف اکبری دور کی اعلیٰ درجہ کی فن مصوری کی نشان دہی کرتی ہیں تو دوسری طرف اکبر کے آزاد خیالات کی غمازی۔

۴۔ ترکی سلطانہ کا محل: ترکی سلطانہ کے محل کو "بے نظیر اور مرصع الماس دان" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ محل، سیکری کے شاہی محلات میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ

اس کی عمارت فنِ سنگ تراشی کا حسین اور بے بہا نمونہ ہے۔ یہ چھوٹی سی مگر متناسب عمارت واقعی اس قابل ہے کہ کسی شہزادی کی رہائش گاہ کا فخر اس کو حاصل ہو سکے۔ اس محل پر ایک اچٹتی سی نظر ہی پروفیسر رش بروک ولیمس (PROF RUSHBROOK WILLIAMS) کے اس قول کی یاد دلاتی ہے کہ "ہندوستان کے دورِ جدید کا آغاز بابر سے ہوا"۔ واقعی دورِ متوسط کی طرزِ تعمیر میں دورِ جدید کے مزاج و ذوق کی آمیزش کی اوّلین مثال ترکی سلطانہ کے محل میں ملتی ہے۔ اگر سنہرا مکان اکبری دور کی مصوری کا شاہکار ہے تو یہ محل اکبری فنِ سنگ تراشی کا اعلیٰ مرقع ہے۔ اس محل کی دیواروں کو متعدد حصّوں میں بانٹ کر، جنگل، سمندر، اشجار، بیل بوٹے، جھاڑیاں وغیرہ نقاشی کے ذریعہ دکھائی گئی ہیں جھاڑی میں بیٹھے شیر اور پیڑوں پر بیٹھے مور بہ آسانی نظر آ سکتے ہیں۔

۵۔ راجہ بیربل کا محل: راجہ بیربل کا محل اپنے حسن و رعنائی اور عظیم فن کاری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگر کوئی اور اکبری عمارت اس کی دلکشی اور حسن کے مقابلہ پر لائی جاسکتی ہے تو وہ ہے ترکی سلطانہ کا محل۔ مگر یہ چیز تعجب خیز ہے کہ دونوں عمارتیں وضع قطع، آرائش اور زیبائش میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں یہ محل کافی اونچی کرسی دے کر بنایا گیا ہے۔ اکبر کی جملہ رہائشی و خانگی عمارات میں صرف یہی ایک ایسا محل ہے جہاں گنبد، باعثِ زینت ہے۔ مسلم فنِ تعمیر میں گنبد معبدوں اور مقبروں پر بنایا جاتا ہے۔ مگر اس مغل شہنشاہ کی جدّت طرازی تو دیکھئے کہ اس گنبد کے سائے میں ایک برہمن محوِ خواب ہوتا تھا۔

۶۔ پنچ محل: پنچ محل فتح پور سیکری کی سب سے عالی شان پنچ منزلہ بارہ دری



دیوان خاص، فتح پور سیکری

نما عمارت ہے۔ اس عمارت کا مقصد کیا تھا، یہ کسی کو معلوم نہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ اس محل کے ہوادار ایوانوں میں اکبر اپنے مخصوص درباریوں کے ساتھ غروب آفتاب اور قرب و جوار کے منظر سے لطف اندوز ہوتا ہوگا۔ یا پھر یہ عمارت شاہی حرم سے منسلک خواتین کے لیے تفریح گاہ رہی ہوگی اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس عمارت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ہر اوپری منزل نچلی منزل سے چھوٹی ہوتی گئی ہے یہاں تک کہ سب سے اوپر چھ کھنٹے کھمبوں پر سہارا لیے صرف ایک خوبصورت سی چھتری ہے۔ بقول ہیول، اس عمارت کا نقشہ قدیم بودھ طرز تعمیر سے اخذ ہے کیوں کہ قدیم ہندوستان میں اس وضع کی متعدد عمارتیں تھیں۔ جو خانقاہوں کا کام دیتی تھیں جن کو امینہ کہا جاتا تھا۔ اسی طرز کی ایک مثال بیجاپور کے قلعے میں بھی ملتی ہے فرشی منزل میں چھپن ستون ہیں اور سب کے سب بہترین نقاشی کے نمونے مگر حیران کن بات یہ ہے کہ کسی بھی دو کھمبوں کی بناوٹ، نقاشی اور حسن کاری ایک جیسی نہیں ہے کہیں پر جین طرز ہے، کہیں راجپوت وضع اور کہیں مسلم انداز، لیکن اتنی مختلف النوع نقاشی آنکھوں کو بری نہیں لگتی بلکہ یہ ملا جلا طرز ایک حسین اور دلکش سماں پیدا کر دیتا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ عمارت اکبر کی رواداری اور وسیع النظری کی آئینہ دار ہے بہ حیثیت مجموعی، پنچ محل کی بنیادی ساخت اور وضع پر ہندو اثر زیادہ غالب ہے۔ آرائش اور حسن کاری کے لیے گھنٹیوں اور زنجیر کی بیلوں کا آزادانہ استعمال بھی ہوا ہے۔

۷۔ **دیوان خاص**: فتح پور سیکری میں اکبر کا دیوان خاص کلاسیکی تصورات

اور دورِ قدیم سے منسوب حسن اور عہدِ جدید کی نفاست اور مزاج کا ملا جلا اظہار ہے۔ سیکری کے دیوان دار الحکومت کی جملہ عمارتوں کے مانند یہ بھی کوئی بڑی عمارت نہیں ہے اور نہ سنگ تراشی اور گہری نقاشی کا کوئی خاص نمونہ ہے۔ مگر پھر بھی بڑی دل کش عمارت ہے، بالکل اپنے خالق کی شخصیت کے مانند ہے۔ اس عمارت کا خاص پہلو اس کی ساخت ہے جو تعمیراتی کاوشوں اور فن کاری کی نہایت اچھی مثال ہے۔ دیوان خاص دو مراتب ہوتے ہوئے بھی ایک منزلہ عمارت ہے۔ اس کا سب سے زیادہ لائق توجہ جز وسطی ستون ہے۔ اس ہشت پہل ستون کی نقاشی بہت سبک اور نفیس ہے اور کسی بہت ہی بڑے چابک دست کے کمالِ فن کی مرہونِ منت ہے اس ستون کے اوپر شاہی تخت رکھا رہتا تھا جس کے پلیٹ فارم کو روکنے کے لیے لاتعداد منقش چھت گیریاں ہیں۔ ان چھت گیریوں (BRACKETS) اور ستون کے الحاق سے گمان ہوتا ہے کہ سورج سے شعاعیں پھوٹ رہی ہوں یا جیسے ستون نہیں ہے بلکہ سورج مکھی کا پھول ہے۔ دراصل اس ستون کا خیال ہندو دیو مالا سے اخذ کیا ہوا ہے جس کے مطابق برہما کے بطن سے نکلا ہوا کنول کا پھول وشنو کی نشست گاہ ہے۔

۸۔ **جامع مسجد**: فتح پور سیکری کی کلاں مسجد وہ مسجد ہے جس کے منبر سے اکبر نے دینِ الٰہی کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس مسجد کو اکبر نے اپنے نئے فرقے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ حالاں کہ مسجد کے ایک کتبہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دراصل مسجد الحرام کی نقل ہے۔ لیکن مسجد کی بناوٹ پکار پکار کر کہتی ہے کہ وہ ہندوستانی کاری گروں کی صناعی اور اپنے خالق کے ذہنی کیفیات سے

کی حامل ہے۔ مختلف مذاہب سے اخذ شدہ خط و خال اس مسجد کا جزو ہیں ان سے قطع نظر یہ عمارت خالصتاً اسی قومی طرز تعمیر کا نمونہ ہے جس کی اختراع اکبر نے کی تھی۔ مسجد کے صحن میں حضرت خواجہ سلیم شاہ چشتی علیہ الرحمہ کی درگاہ ہے جو مغل طرز تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ خصوصی طور پر اس کی جالی کا کام بہت جاذب نظر ہے

۹۔ بلند دروازہ۔ مسجد میں عوام کا داخلہ جنوبی دروازے سے ہے جس کو بلند دروازہ کہتے ہیں۔ یہ ہندوستان کا بلند ترین اور دنیا کے سب سے اونچے دروازوں میں شمار کیا جاتا ہے، گو یہ دروازہ ایرانی وضع پر نیم گنبد نما ہے پھر بھی اکبر کے اپنائے ہوئے طرز کا حامل ہے۔ یہ دروازہ ۱۶۰۲ء میں اکبر کی دکھن کی فتوحات کی یادگار میں بنوایا گیا تھا۔ ماہرین فن تعمیر متفق ہیں کہ یہ دروازہ ہندوستان کے فن تعمیر کی انتہائی معراج ہے۔ سیکری کی دوسری عمارتوں کی طرح بلند دروازہ بھی تمام تر سنگ سُرخ سے بنا ہے جس پر کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ ہاں نہایت نفیس نقاشی کا کام ہے اور سنگ مرمر کی دل فریب پچی کاری کی گئی ہے۔

فتح پور سیکری کی عمارتیں دیکھنے کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اکبری طرز کو "مسلم" طرز تعمیر سے دور کا بھی واسطہ نہیں کیوں کہ مسلم ممالک میں جس طرز کی عمارتیں بنی ہیں اس طرز کا اکبر کی عمارتوں میں شائبہ تک نہیں ملتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکبر نے ہندو طرز تعمیر کو بھی بجنسہٖ نہیں اپنایا۔ البتہ اُس کی عمارتوں میں ہندوستان کی قدیم طرز تعمیر کے خط و خال ضرور ملتے ہیں۔ اکبر نے ہر مذہب سے ایسی چیزیں اپنائی تھیں اور اسی اصول کو اپنی تعمیرات میں بھی پیش نظر رکھا۔ اکبر کی

عمارتوں میں ہم فن کاری بہ درجۂ اتم پاتے ہیں لیکن فضول خرچی نہیں جو اس کے پوتے شاہ جہاں کی عمارتوں کے طرز میں ملتی ہے۔ اکبری عمارتیں حسین وجمیل ہیں مگر ان میں سادگی سے نکھار پیدا ہوا ہے۔ اکبری عمارتوں کی انفرادیت اور حسن کا انحصار ان کی وضع اور طرز تعمیر میں مضمر ہے نہ کہ کام میں لائے جانے والے مسالوں بیش بہا اطالوی سنگ مرمر، جواہرات کی جگمگاہٹ اور خیرہ کن رنگ و روغن پر۔ اکبر نے جواہرات سے مرصع سنگ مرمر کے بجائے آسانی سے دستیاب اور کم قیمت والے سُرخ پتھر کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی لیے اس کے دور کو تاریخ فن تعمیر کا رزمیہ دَور کہا جاتا ہے۔ اس کی سبھی عمارتیں ٹھوس اور پُرشکوہ ہیں اور مردانہ حسُن کی شان رکھتی ہیں۔ اس کے برخلاف شاہ جہانی عمارتیں نسوانیت، رعنائی، نزاکت اور زنانہ حسن و جمال کی پیکر معلوم ہوتی ہیں۔ اکبری عمارتوں میں سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کی کوئی دو عمارتوں تو کیا ایک ہی عمارت کے دو ستون بھی وضع کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہیں لیکن اس اختلاف سے ذہن میں انتشار نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہی اختلاف ایک حسُن پیدا کرتا ہے اور یہی اکبری طرز کی خصوصیت ہے۔

فتح پور سیکری کا شہر آج بھی اپنی ویرانی اور زبوں حالی میں جملہ فنون لطیفہ کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہے۔ اس کی عمارتیں آج بھی فن تعمیر، فن مصوری، سنگ تراشی اور فن طغرانویسی کی مخلوط شاہ کار ہیں۔ مثال کے طور پر فن مصوری ہی کو لیجئے۔ خواب گاہ، بی بی مریم کی کوٹھی اور حمام کی دیواروں کو مزین کرنے والی مصوری در اصل وہ گم شدہ کڑیاں ہیں جو اجتائی روایات کو وسط ایشیا سے برآمد کی ہوئی بہزاد کے فن مصوری سے ملاتی ہیں۔ خواہ سیاست ہو یا مذہب یا فنون لطیفہ، اکبر کی حیثیت ہر شعبے میں

ایسی ہی گم شدہ کڑی کے مانند ہے۔ اجنتا کے فنی روایات اس ملک کے فن مصوری کا حصہ تھے مگر اکبر نے انھیں پر اکتفا نہ کی بلکہ بہزاد کے فن کی قلم اجنتا کے فن میں لگادی اور فن معوری میں ایک نئے مکتب کی بنیاد ڈالی۔ مغل اسکول میں موضوع تو ہندستانی تھے مگر ان کا اظہار بہزاد کے فن کے مطابق تھا۔ فن سنگتراشی کے شعبے میں بھی تقریباً ایسا ہی ہوا۔ اگر ہیکیلے کا قول اپنی جگہ صحیح ہے کہ "فن سنگتراشی اقوام کے مخصوص ذہن فلسفہ اور مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے" تو فتح پور سیکری کے فن سنگتراشی کے اعلیٰ نمونے اکبر کی سرکردگی میں ہندوستان کی ایک قومی سلطنت کے مزاج کے حقیقی علم بردار ہیں۔

اکبر کی وفات کے بعد طرز تعمیر میں سنگ سرخ ذریعہ اظہار نہ رہا۔ شہتیر اور چھت گیریوں کے اصول کو خیرباد کہہ دیا گیا۔ ہندو سجاوٹ مثلاً شیروں اور موروں کی تصویریں متروک ہو گئیں۔ کیونکہ یہ اسلامی عقائد سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ اکبر کے وارثین میں صرف شاہجہاں ہی اکبر کے احساسات کی رفعت اور بلند تخیل کو چھو سکا لیکن اس کے دور میں مغل فن تعمیر اور اسلوب اکبر کے رزمیہ دور سے نکل کر ایک نغماتی دور میں داخل ہو گیا۔ شاہجہاں کی عمارتوں میں حسن ہے، رعنائی ہے لیکن سنگ مرمر کے استعمال، سجاوٹ کے لیے جواہرات سے پچی کاری اور یہاں تک کہ تاج کی دل آویزی اور دلفریبی اور طرز اور اسلوب کی ان رفعتوں کو نہ چھو سکی۔ جن کو اکبر کی تخیل پائمال کر چکی تھی۔

اکبر اور ہندوستانی قومیت

گبن کا مقولہ ہے کہ یوں تو مورخین نے کئی تاجداروں کو "اعظم" کے عظیم لقب سے نوازا ہے لیکن شاہ سلیمان اعظم ہی ایک ایسا تاجدار ہے جو (اس عظیم لقب کے سلسلہ میں) اسم بامسمیٰ کا مصداق ہے لیکن اس میں ہم جلال الدین محمد اکبر کے نام کا اضافہ کر سکتے ہیں جس کی عظمت کا سبب اس کا شاندار فاتحانہ کردار یا اس کی دور رس سیاسی اور اقتصادی اصلاحیں ہی نہ تھیں اس کی عظمت کا راز اس کے قوم ساز منصوبہ میں مضمر ہے جس نے اس کو مشرق کے دیگر عظیم فرماں رواؤں پر ایک گونہ فضیلت عطا کر دی۔

تقسیم کے پہلے کا ہندوستان ایک تحتی براعظم تھا بلکہ اس سے کچھ زائد ہی تھا۔ زبان، مذہب اور نسل کے تنوع نے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا تھا اور اس کے (ہندوستان کے) لقب (تحتی براعظم) کو محفوظ۔ باوجود اس کے اس ملک کی بنیادی وحدت اختلاف سے بالاتر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس حد تک یہ وحدت عملی جامہ پہن سکی ہے؟

ماضی میں حکمرانوں کی یہ تمنا رہی ہے کہ وہ وحدت کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے جگر درنی کے محبوب نصب العین کو حاصل کر لیں۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے

کے لیے جو طریقے اپنائے گئے وہ خصوصی طور پر فوجی تھے۔ جیوں ہی حکمران کے زبردست اور آہنی پنجوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور مرکزی حکومت میں ضعف آیا متعدد نیم آزاد حکومتیں عالم وجود میں آگئیں۔

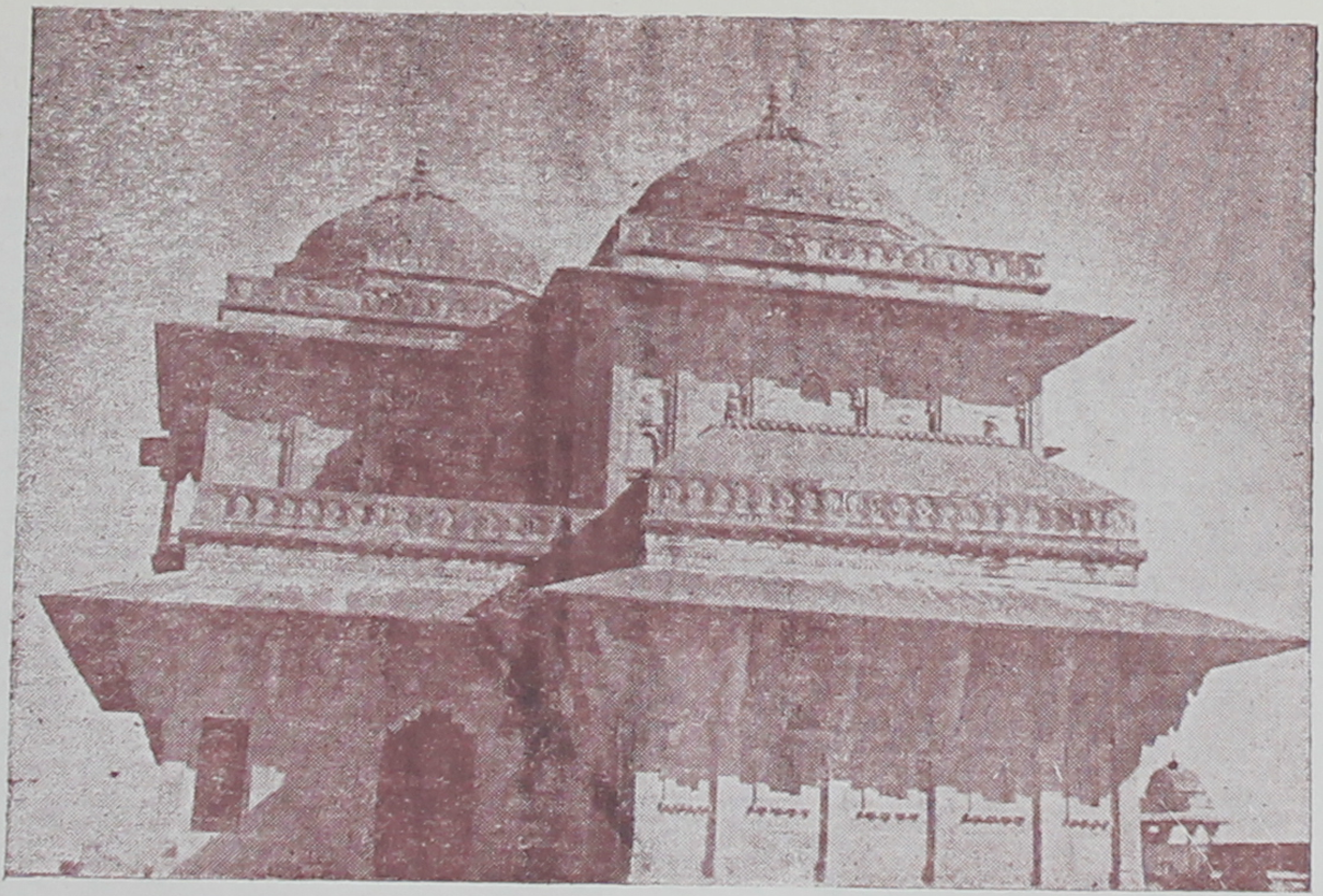
ہندو مذہب کو اس ملک میں پھیلنے والا پہلا مذہب قرار دیا جا سکتا ہے ہندو مذہب کی جامع و مانع تعریف کرنا بہت ہی مشکل ہے یہ ایک عالمگیر مذہب ہے جو اپنے اندر خیال اور فلسفہ کے کتنے ہی نظام رکھتا ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان میں بالعموم جتنے مذاہب باہر سے آئے ان سب نے اپنی انفرادیت کھو دی اور" اس عظیم کل" یعنی ہندو مذہب میں مدغم ہو گئے۔

اسلام | ہندوستان میں اسلام کی آمد سے ملک کی تاریخ میں کچھ مخصوص سیاسی اور تہذیبی خصوصیات ابھرتی ہیں۔ اسلام ایک عملی مذہب ہے۔ اگر ایک شخص کلمہ پڑھتا ہے، چند مخصوص بنیادی اصولوں کی پابندی کرتا ہے اور ان ہدایات پر کاربند ہوتا ہے جن پر عمل کرنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے تو وہ مسلم ہے اور صادق الایمان۔ اگر وہ مذہب کے اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے یا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن عذاب کا مستحق ہوگا۔ لیکن اسلام کسی اور دین کا قائل نہیں الدین عند اللہ الاسلام" قرآن کا دعویٰ ہے۔ بنیادی اصولوں پر مصالحت کا کوئی سوال نہیں یہاں تک کہ اسلام میں صوفیہ کے خلاف بھی کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور تصوف کی ہمت شکنی کی گئی۔ یہ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بالآخر اسلام میں صوفیہ کو مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ ایک ایسے بے لوچ عنصر، اسلام کا تعارف آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان میں ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی سے اسلام کے اثرات

ملک میں واضح طور پہ دکھائی دینے لگے۔ ہندو مذہب جس نے تمام نووارد عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اپنے آپ کو ایک سخت مشکل سے دوچار پایا۔ اسلام اور ہندو مذہب میں بعد المشرقین تھا۔ اسلام ہندو مذہب سے مختلف تھا اور دونوں مذہبوں میں مصالحت بالکل ناممکن تھی ہندو اور مسلمان کلیتہ اور بنیادی طور پر ایک دوسرے کے حریف تھے ان کی رسمیں، طور طریقے، رہن سہن اور لباس ایک دوسرے سے جُداگانہ تھے ان میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

ملک کے قدیم باشندے ہندوؤں اور نووارد مسلمانوں میں سیاسی سیادت کے لیے ایک دوڑ شروع ہوگئی۔ یہ ایک زبردست کش مکش اور ایک خوفناک رسّہ کشی تھی۔ مورخین کا کہنا ہے کہ ان دونوں گروہوں کی آویزش حقیقتاً دو متضاد سماجی نظاموں کی جنگ تھی جن میں سے ایک قدیم روبہ انحطاط اور دوسرا تہور اور شباب کی قوتوں سے بھرپور تھا اور اس جنگ کا خاتمہ بالآخر موخر الذکر کے حق میں ہوا۔

<u>خاندانی منصوبے</u> (DYNASTIC DESIGN) مسلمانوں نے اپنی سیاسی بالادستی قائم کرلی لیکن ہندو مسلمانوں کی نئی جنگی چالوں اور فوجی برتری سے مغلوب ہوئے تھے۔ تہذیبی میدان میں انھوں نے شکست نہیں کھائی تھی۔ جب بھی ہندوؤں کو موقع ملا انھوں نے بغاوت کی، مسلم حکومت کے خلاف سر اٹھایا اور مسلمانوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اُتار پھینکنے کی تدبیریں کیں نئے سیاسی نظام سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کرسکے اور نہ مسلمانوں ہی کی طرف سے اپنی نوزائیدہ سلطنت کے لیے ہندوؤں کی خیراندیشی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔



راجہ بیربل کا محل سیکری

ہندوستان میں مسلم حکومت کی پہلی تین صدیوں کا زمانہ فوجی اور سیاسی میدانوں میں نئے نئے تجربوں کا زمانہ تھا۔ ان تین صدیوں کے مسلم حکمرانوں کو خاص فکر یہ تھی کہ وہ کس طرح حکومت کو اپنے خاندان میں موروثی بنا دیں۔ ان حکمرانوں کا نظام حکمرانی فوجی استبداد پر مبنی تھا جس کا انحصار فوجی طاقت پر تھا اور معمولی سے معمولی سرکشی اور نافرمانی کا ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ قتل عام پر منتہی ہوتا تھا۔ شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ وہ کس طرح سلطنت کو اپنے خاندان میں باقی رکھ سکیں انھوں نے اس مقصد کے لیے سخت جدوجہد کی لیکن اس سلسلہ میں ہندوؤں کو بالکل نظر انداز کیا گیا نہ انھیں اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ وہ ادارۂ شاہنشاہی کی تعمیر میں کوئی حصہ لے سکیں۔ علاء الدین خلجی مطلق العنان ہونا چاہتا تھا اس لیے ہندوؤں کو پاؤں تلے کچل ڈالا گیا۔ محمد تغلق مورخین کی بجا ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ فیاضانہ اور روادارانہ برتاؤ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے نت نئے منصوبوں میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے فرصت ہی نہ تھی کہ وہ سلطنت کی پالیسی کا کوئی قوم پرورانہ نمونہ پیش کرتا۔ فیروز تغلق اور سکندر لودھی رجعت پسند تھے ان کے عہد میں ہندوؤں کو ملکی سیاست میں بار نہ تھا۔

شیر شاہ :۔ شیر شاہ پہلا مسلم حکمران تھا جس نے صحیح نقطۂ نظر کو اپنایا اور صحیح سمت میں رہنمائی کی۔ پروفیسر قانون گو کے لفظوں میں "شیر شاہ کی تخت نشینی سے فراخ مشرب اسلام کا وہ دور شروع ہوا جو اورنگ زیب کی رجعت پسندانہ پالیسی سے قبل تک رہا۔ شیر شاہ اکبر کے مقابلہ میں بجا طور پر دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ پہلا مسلمان فرماں روا ہے جس نے سب سے پہلے ایک ہندوستانی قوم کی تخلیق کی کوشش کی۔" وہ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے عوام کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھا اس نے اس بات کو محسوس کیا کہ حکومت کا ہردلعزیز بنانا ضروری ہے۔ بادشاہ کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے حکومت کرنی چاہیے۔ ہندوؤں کو عدل پرستی

اور رواداراَنہ پالیسی سے اپنانا وقت کا اہم تقاضا ہے اس نے ہندوؤں پر اعتماد کیا اور انھیں فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس کا ایک بہترین جنرل برہم جیت گوڑ تھا۔ جس کو چوسا اور بلگرام کی جنگوں کے بعد ہمایوں کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا۔ ٹوڈرمل نے شیر شاہ کے دور میں اقبال کا منھ دیکھا۔ شیر شاہ کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر کام کیا تو سلطنت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی یہ تمنا تھی کہ ہندو اور مسلمان مل جل کر بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں۔

بدقسمتی سے شیر شاہ کا دور حکومت بہت ہی مختصر ثابت ہوا اور اسے اپنے قوم پروری کے نئے تجربوں کو بروئے کار لانے کا پورا پورا موقع نہ مل سکا۔ بایں ہمہ اس کی اصلاحات نے اس کے جانشینوں کے سامنے غور و فکر کے بہت سے دروازے کھول دیئے۔ شیر شاہ کے دور حکومت کا ورثہ بہت ہی اہم ہے یہ صحیح ہے کہ ہندوؤں کی حالت شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانہ میں جتنی اچھی تھی اس سے پہلے کبھی بھی نہ تھی۔ پھر بھی شیر شاہ اور اکبر میں بہت تفاوت ہے۔ شیر شاہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا وہ اکبر جیسا نہ تھا۔ ہندوستان کے مغل حکمرانوں میں بابر کے پاس نہ تو وقت ہی تھا اور نہ اس میں کسی تعمیری کام کی صلاحیت ہی تھی کہ وہ ایک اعلیٰ صحت مند قومی عمارت کی تعمیر کر سکتا۔ ہمایوں کو اس سمت اقدام کا موقع ہی نہ ملا مشیت کا منشاء یہ تھا کہ اکبر شمالی ہند میں مسلم راج کی تین صدیوں کے تجربوں اور سبق کی روشنی میں قومی تعمیر نو کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔

تنگ نظری:۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اکبر کے زمانہ تک ہندوستان کی متحدہ قومیت کے مسئلہ کو کماحقہ، حل کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ کام بہت ہی مشکل تھا۔ اکبر کے مخالفین اکبر کے قوم ساز منصوبہ کے محرکات کے سلسلہ میں جن باتوں کا

نام لیتے ہیں وہ ان کے متعصبانہ نقطۂ نظر اور معاندانہ رجحان کی غمازی کرتی ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ کا کہنا ہے کہ "اکبر اپنی غیر مسلم بیویوں کے زیر اثر تھا اسی لیے اس نے ہندوؤں کو اپنانے کی کوشش کی" اس عظیم المرتبت شہنشاہ کے نام کو داغدار بنانے کے لیے اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے! یہ نیک ارادوں اور اونچے آدرشوں کا محدود نظر سے جائزہ لینا ہے۔ جہاں تک اکبر کے غیر مسلم عورتوں سے شادی کرنے کا تعلق ہے اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اکبر نے غیر مسلم عورتوں سے رشتہ ازدواج استوار کرنے میں ایک خصوصیت برتی اکبر سے پہلے غیر مسلم عورتوں کو قبول اسلام کے بعد ہی رشتہ ازدواج میں منسلک کیا جاتا تھا لیکن اکبر نے اپنی غیر مسلم بیویوں کو اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ یقیناً ایک بدعت تھی لیکن اکبر سے پہلے عثمانی ترکوں نے قبول اسلام کے بغیر عیسائی عورتوں سے شادیاں کرکے مثال قائم کردی تھی۔

بادشاہ مستثنیات میں سے ہوتے ہیں۔ اکبر بھی مستثنیات میں سے تھا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی شادیوں کا رواج نہ تھا اور نہ اکبر نے خود اس قسم کی شادیوں کی کوئی ہمت افزائی کی (بدایونی بی۔ آئی ایس جلد دوم صفحہ ۳۹۱) اکبر کی قوم پرورانہ پالیسی کا بین فرقہ جاتی شادیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کرنل ٹاڈ کا خیال ہے کہ اورنگ زیب سے زیادہ اکبر کی پالیسی، حالانکہ اس کے مضمرات واضح نہ تھے، راجپوتوں کے لیے سم قاتل اور مضرت رساں تھی۔ ٹاڈ کی اس تنقید کو صرف جذبات کی بنا پر ہی حق بجانب قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ اکبر نے اجازت راجپوتوں کا ایک فرقہ پیدا کردیا ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے

دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔ وہ اپنی رعایا کے کسی فرقہ کا بدخواہ نہ تھا۔ راجپوتوں کو وہ سب کچھ ملا جس کی تمنا وہ کر سکتے تھے ۔ جاگیریں۔ اعلیٰ عہدے اور ترقی کے مواقع ۔ اِس کے دورِ حکومت میں ہندو مذہب نے ترقی کی اور ہندو ادب کا احیاءِ عمل میں آیا۔

عصر کا فرزندِ جلیل :- ہندوستان کی نشاطِ ثانیہ اور اصلاح کے اس سچے فرزند اکبر کی حکومتی پالیسی کو سمجھنے کے لیے ایک صاف دماغ کی ضرورت ہے جو اُس کی "لوحِ سادہ" کی طرح ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو ۔ اکبر کا دورِ حکومت تعمیر و اصلاح اور قومی یکجہتی کی تخلیق کرنے والے کارناموں کا دور تھا ۔ ابوالفضل کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ " بادشاہ عصر کی روح کو سمجھتا تھا اور اس نے اس دور کے اقتضاء کو پیشِ نظر رکھا اس نے ایک قوم کے خالق کا کردار ادا کرنا چاہا اس لیے اکبر اس دور کا ۔ جس میں کہ وہ خود سانس لے رہا تھا ۔ اس کا خالق بھی تھا اور مخلوق بھی ۔

یہ صحیح ہے کہ جب سولھویں صدی عیسوی کا آغاز ہوا تو اس وقت ملکی آبادی کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی اور توازن کے طاقت ور رجحانات پیدا ہو چکے تھے لیکن اب بھی بہت کچھ کرنا باقی تھا ۔ اب بھی کچھ نفاق باقی تھی جس کی اصلاح ضروری تھی ۔ فرقوں کے بنیادی اصولوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور ان میں کوئی تغیر راہ نہیں پا سکا تھا ۔ اکبر کی دین یہ ہے کہ اس نے اس روح کو پہچانا اور اسے اٹھا کر تختِ شاہی پہونچا دیا ۔ اکبر کی پالیسی کو روادارانہ کہنا اسے غلط نام سے یاد کرنا ہے ۔

اس یقین نے اس کے دماغ میں راہ پائی کہ بابر کی قائم کی ہوئی اور ہمایوں کی آگے بڑھائی ہوئی سلطنت کے جلد ختم ہو جانے کے مختلف اسباب میں سے ایک خاص سبب

حکومت کا غیر ملکی کردار تھا۔ نہ تو باقی ماندہ پٹھان سرداروں نے ہی اور نہ ہندو اکثریت ہی نے مغلوں کو اس سرزمین کا فرزند تسلیم کیا اگر ایک استوار شاہی ادارہ قائم کرنا ہے تو حکومت کے غیر ملکی کردار کو ختم کر کے اس اہم خلاء کو پر کرنا ہو گا۔ اکبر اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کے لیے پوری طرح موزوں تھا اس کا دماغ تہذیبی سیاسی اور مذہبی تعصبات سے پاک وصاف تھا۔

بات اتنی ہی نہ تھی۔ ہندوستان کی پچھلی صدیوں میں بڑے بڑے سلاطین ہوئے جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہو جس میں ایک قوم کی تخلیق اور تعمیر کی صلاحیت رہی ہو۔ حکومت کو ہر دلعزیز نہیں بنایا گیا اس کی جڑ کمزور رہی۔ اسے مستحکم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ اکبر نے اس نکتہ کو سمجھا اور اپنی سلطنت کو ایسے آدرشوں کی وسیع بنیاد پر قائم کرنے کی ٹھانی جو بیک وقت اعلیٰ نیک۔ عدل پر مبنی اور غیر جانبدارانہ تھا۔

خصوصی خدوخال: تجربہ نے یہ بات سکھادی تھی کہ حکومت کے کاروبار میں صرف اپنے ہم مذہبوں پر ہی بھروسہ کرنا عقلمندی سے بعید ہو گا۔ اس کے دو اسباب تھے اول یہ کہ مسلمانوں میں خود بینی اور خود نمائی کا دل آزار جذبہ پیدا ہوتا تھا اور دوسری بات یہ تھی کہ آبادی کے بیش حصہ کو سلطنت کے معاملات میں حصہ نہیں ملتا تھا اس میں بجا طور پر ناراضگی پیدا ہوتی تھی۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی پالیسی اپنائی جائے جس سے ہندوؤں کو قریب لایا جاسکے اور پامالی کی پالیسی کو ترک کر دیا جائے۔ آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کو نظر انداز کر دینا ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ اس لیے اکبر نے اپنے سیاسی دستور العمل میں دو اہم شقوں کو جگہ دی ۔۔۔ بلاتفریق مذہب وملت سلطنت کے ہر فرد کے ساتھ

مساوی برتاؤ اور سلطنت کے تمام عہدوں کے دروازے ہر صاحب صلاحیت کے لیے کھول دینا ان شقوں کو اکبر کی پالیسی کے "بنیادی خد و خال" قرار دے سکتے ہیں اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک اپنی برتری کے احساس میں مگن تھے ان کے احساس برتری پر روک لگا دی جائے۔ مزید برآں اکبر مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا ایک طالب علم تھا۔ چکرورتی کے آدرش میں اس کے لیے ایک ناقابل تسخیر کشش تھی کیونکہ یہ آدرش ہندو مسلم دونوں کے آدرشوں کے مطابق تھا اور اس آدرش کا حصول اسے اس بلند پوزیشن تک پہونچا سکتا تھا جس تک ترکوں کے عہد میں کسی بھی حکمراں کو پہنچنا نصیب نہ ہوا تھا۔ اس وسیع پس منظر میں راجپوتوں کے بارے میں اکبر کی پالیسی کو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اکبر کی راجپوت پالیسی ایک بہت بڑے نصب العین کا ایک جزو تھی ـــــ ایک ایسا نصب العین جو اکبر جیسے عظیم المرتبت حکمراں کے لیے عزیز ہی نہیں بلکہ تقدس کا حامل تھا۔ راجپوت ہندو سماج کے دل و دماغ اور دست و بازو تھے۔ وہ ہندوستان کے قدیم مقدس کلچر کے امین اور محافظ تھے۔ اگر راجپوت مغلوں کے دوست ہو جاتے ہیں تو ہندو سماج کے دماغ میں ایک بہت بڑا تغیر ناگزیر ہو جائے گا۔ راجپوت شجاع ترین جنگجو تھے اور ان کی ذہانت کو اس سیاسی عمارت، ـــ جس نے اکبر کا دل موہ لیا تھا ـــــ کی تعمیر میں کام لایا جا سکتا تھا۔

دین الٰہی: ۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر نے ایک ایسے بڑے کام کا آغاز کیا جو زمانہ کا اقتضا اور ایک نیک تمنا تھی ـــــ یہ مہم کانٹوں سے بھری اور اپنی خصوصیات میں منفرد تھی دو ایسے عناصر کو قریب لانا اور انھیں ایک رشتۂ وحدت میں منسلک کرنا جو بنیادی طور پر ایک دوسرے کے برعکس ہوں ـــــ یہ ایک ایسا اہم کام تھا جس کے

لیے فکر و نظر کی استثنائی صلاحیت کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکبر کی تحسین و آفریں کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور تحسین و آفریں کے جو پھول اب تک اکبر کی بارگاہ میں پیش کیے گئے ہیں یقیناً اکبر اس کا مستحق تھا ہم اس سے غیر محدود النسبت محسوس کرتے ہیں۔ اس نے جو کچھ کیا وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک رشتۂ وحدت میں پرونے کے بلند نصب العین کے حصول کے لیے کیا۔ اس نے ہندوستان کی متحدہ قومیت کے مسئلہ کو ہر نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی۔ دین الٰہی یا توحید الٰہی ایک نیم سیاسی مذہب تھا۔ اس کی بنیاد قومی وحدت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ڈالی گئی تھی۔ اکبر کا نظریہ تھا کہ مذہب کی فروعات اور مذہبی تنظیموں کی پروا کیے بغیر عوام کو خدا ترس ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ میں "اکبر کا دین الٰہی ایک قاہر حکمراں —— جو یہ نہیں جانتا کہ اپنے وسیع اختیارات کو کس طرح استعمال کرے —— کے واہمہ کی تخلیق نہ تھا بلکہ یہ لابدی نتیجہ تھا ان قوتوں کا جو ہندوستان کے سینہ کی گہرائیوں میں طوفان برپا کیے ہوئے تھیں اور جو کبیر جیسے مصلحین کی تعلیمات میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ ناساعد حالات نے اکبر کی کوششوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا لیکن حیثیت اب بھی اسی منزل کی طرف اشارہ کر رہی ہے" اکبر کے دور کی ادبی تحریکات زیادہ بارآور ثابت ہوئیں۔ اکبر فارسی کے ذریعہ ملک میں ایک تمدنی سنگم پیدا کرنا چاہتا تھا اس نے عربی اور سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا سماجی اصلاحیں اور اکبری دور کی تعلیمی پالیسی قومی وحدت کے مقدس مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہوئیں۔

قومی اتحاد :- اس موقعہ پر اکبر کی فتوحات اور تقریباً سارے ملک کے ایک سیاسی نظام کے تحت متحد ہو جانے کے بارے میں چند لفظوں میں اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا ایڈورڈ ٹیری نے اکبر کو تالاب کی اس بڑی مچھلی کے مماثل قرار دیا ہے جو اپنے کمزور پڑوسیوں کا شکار کرتی رہتی ہے۔ ولسنٹ اسمتھ اکبر کو دولت و طاقت کا حریص کہتے ہیں۔ لیکن فلسفۂ سیاسیات کا ہر طالب علم اتنی بات ضرور جانتا ہے کہ بغیر سیاسی وحدت کے قومی اتحاد ناممکن ہے۔ اکبر نے اپنی فتوحات کے ذریعہ متضاد عناصر کو ہم آہنگ کر کے ایک حسین وحدت کے سانچے میں ڈھال دینے کی سعی مشکور کی۔

لیکن اکبر کی پالیسی آگے نہ چل سکی حالاں کہ جہانگیر اور شاہجہاں نے اکبری روایت کو قائم رکھا پھر بھی انھوں نے صحیح العقیدہ مسلمان کی طرح حکومت کی۔ اورنگ زیب کے عہد میں حب پسندی نے اپنی انتہائی شکل اختیار کر لی لیکن ہم جانتے ہیں کہ اکبر کی محنت اکارت نہیں گئی اس کی پالیسی کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ ہندو عوام مغل تخت شاہی کے وفادار اور پرستار بن گئے یہاں تک کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی ہندو خود ہندو کے خلاف مغل تاج کی عظمت کے لیے ہتھیلی پر جان رکھ کر جنگ کرتے تھے۔ بلاشبہ اکبری پالیسی نے مغلیہ سلطنت کو پائیداری اور استحکام بخشا اور یہ اسی پالیسی کے ماتبقی اثرات تھے کہ اورنگ زیب کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں بھی مغلوں کی شاہی روایات چلتی رہیں اکبر نے آریوں کے چکرورتی کے جس آدرش کو اپنایا وہ آج بھی اس بات کا مستحق ہے کہ ملک کے سیاست داں اس کی پیروی کریں۔

اودھ کی دوشیزہ بہو

تاریخ کے اوراق صنف نازک کے حالات اور واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ روس کی زرینہ کیتھرائن کے کردار میں مردانہ عنصر غالب پایا جاتا ہے۔ انگلینڈ کی ملکہ ایلزبتھ سیاسی شعبدہ بازی میں اپنی ذات کا سہارا لیتی نظر آتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ کی شہزادی میری اپنی جان عزیز اور تخت و تاج کو نسوانی جذبات کی قربان گاہ پر نثار کر دیتی ہے۔ خود ہندستان میں رضیہ سلطانہ شہزادی میری کی جانشین بنی۔ چاند بی بی اور رانی درگاوتی کو اپنی سلطنت سے پیار تھا۔ نور جہاں بیگم اثر اور اقتدار کی دیوانی رہی۔

بیگمات دہلی، بیگمات بنگال اور بیگمات اودھ کے کارنامے بھی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہیں لیکن اودھ کی دوشیزہ ملکہ بہو صاحب کی زندگی اور کردار نسائیت کی معراج ہے بہو صاحب ملکہ تھی، بادشاہ وقت کی بیاہتا بیوی تھی۔ لیکن اس نے تیموری وقار اور آن بان کو اپنی دوشیزگی کے دامن میں پناہ دی جاہ و حشم اور سیم و زر اس کے پائے استقامت میں لغزش نہ لا سکے۔

نواب رقیہ سلطان الخاطب بہ نواب سلطان بہو صاحبہ۔ مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی

کی لاڈلی بیٹی اور حضرت شاہ عالم شہنشاہ دہلی کی پوتی تھیں۔ بچپن میں گھر والے پیار سے ان کو بوآ سلطانہ بھی کہتے تھے۔ نواب سلطان بہو نہایت قبول صورت، خوش خلق اور پیکر۔ شرم و حیا تھیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی سلطنت مغلیہ کے لیے پیغام اجل لے کر آئی۔ تیموری شان و شوکت اور جاہ و جلال کا کفن سیا جانے لگا۔ بزم تیموریہ کی شمع تھرتھرانے لگی وہ محل جس کا سنگ بنیاد ظہیرالدین محمد بابر نے رکھا تھا وہ درخت جس کی آبیاری جلال الدین محمد اکبر نے اپنے خون سے کی تھی وہ چمن جس کی آرائش اور زیب و زینت شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی نفاست اور خوش سلیقگی کی مرہون منت تھی، اجڑنے لگا۔ ایک وہ وقت تھا جب دوسرے ممالک کے حکمران مغل فرماں رواؤں کے دامن میں پناہ لینے کے لیے ہندوستان آتے تھے۔ ایک وہ وقت آگیا جب خاندان مغلیہ کے چشم و چراغ گوشۂ عافیت کی تلاش میں دہلی سے نکل پڑے۔ انھیں خانماں بر باددں میں مرزا سلیمان شکوہ بھی تھے۔ دہلی کی ویرانی کے بعد لکھنؤ نے دستگیری کی اور مرزا سلیمان شکوہ بھی رامپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ مگر شہزادہ کی آمد نواب آصف الدولہ کو بری لگی۔ انھوں نے داخلۂ شہر کی اجازت نہ دی۔ کیونکہ چار سال قبل ۱۷۹۰ء میں شہزادہ کے بڑے بھائی مرزا جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت بھی دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ جن کی پینشن نواب آصف الدولہ نے نہایت فیاضی سے پچیس ہزار روپیہ مقرر کردی تھی مگر شہزادہ موصوف سے کچھ ایسے افعال ناروا سرزد ہوئے کہ آصف الدولہ کا دل ان کی طرف سے پھر گیا۔ نواب آصف الدولہ کا خیال تھا کہ مرزا سلیمان شکوہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی کے ہوں گے۔ مگر بعد میں مصالحت ہو گئی۔ نواب آصف الدولہ نے شہزادہ کی

قیام گاہ پر جا کر ان کا استقبال کیا آگے چل کر لارڈ کارنوالس کی سفارش سے چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور مصارف باورچیخانہ اودھ سرکار سے ملنے لگے۔

نواب سعادت علی خاں اور اُن کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر تاقیام بادشاہت بطریق صوبہ دار شہزادہ سے پیش آیا کیے۔

۱۸۱۹ء میں جب نواب غازی الدین حیدر خاں بادشاہ اودھ قرار پائے تو مرزا سلیمان شکوہ سے برابری کے برتاؤ کے خواہاں ہوئے۔ غازی الدین حیدر خاں نے خیال کیا کہ وہ بادشاہت کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں۔ اب خاندان تیموریہ سے رشتہ قائم کرنا چاہیئے۔

چنانچہ انھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر کو مقرر کیا کہ وہ مرزا سلیمان شکوہ کو رضامند کریں کہ وہ اپنی دختر رقیہ سلطان بیگم کی شادی ولی عہد سلطنت مرزا نصیر الدین حیدر سے کر دیں کہا جاتا ہے کہ شہزادہ نے یہ رشتہ قائم کرنے سے صاف انکار کر دیا اس پر ان کی تنخواہ روک دی گئی جس سے سخت مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور گوناگوں مصائب کا چشمہ اُبل پڑا۔ ایک روز روپیہ کا ایسا توڑا ہو گیا کہ دسترخوان پر صرف بھنے ہوئے چنے آئے۔ یہ دیکھ کر شہزادہ اشکبار ہو گیا۔

آغا میر نے میر گلزار علی خاں رفیق الدولہ کو جو شہزادہ کے عقل کل تھے، بہ طمع زر ہموار کیا۔ انھوں نے شہزادہ کے محل خاص نوازش محل کو نشیب و فراز سے باخبر کیا۔ آخر کار اپنی دل نواز بیوی نوازش محل اور رفیق الدولہ کے سمجھانے پر مرزا سلیمان شکوہ نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔

اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے

تاج پوشی کے ایک سال کے اندر رہی جون ۱۸۲۸ء میں خسر اور داماد میں چشمک ہوگئی اور شہزادہ کا لکھنؤ میں رہنا محال ہوگیا۔ پہلے کاسگنج پھر اکبر آباد میں سکونت اختیار کی مرزا سلیمان شکوہ، نصیر الدین حیدر سے اس قدر ناراض تھے کہ اپنے جیتے جی نہ بیٹی کو کبھی بلایا نہ خود ان کو دیکھنے آئے۔

مورخین میں بعض معاملات میں جزوی اختلافات ہیں مگر اس پر سب متفق ہیں کہ ملکہ کے ساتھ شروع سے بہت ناروا برتاؤ کیا گیا نہ مثل دیگر محلات ان کا بیش قرار وثیقہ مقرر ہوا اور نہ حسن سلوک سے ان کی کبھی دلجوئی کی گئی بلکہ اس کے برعکس وہ زیر حراست رکھی گئیں محل کے باہر جانے کی ان کو مطلق اجازت نہ تھی ان کے قدیم ملازمین کو جو ان سے ہمدردی کرتے تھے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اور کسی کی مجال نہ تھی جو ان سے ملاقات کر سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ بیچارگی اور بے بسی میں مرزا سلیمان شکوہ نے ان کی شادی نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دی تھی۔ اس کا بیگم کو دلی صدمہ تھا اور انھوں نے اپنی عالی ہمتی سے یہ ثابت کر دیا کہ باپ کی رضامندی جبر اور دباؤ سے حاصل کی جاسکتی ہے مگر بیٹی کی مرضی کسی قیمت پر بھی نہیں خریدی جاسکتی۔

مرزا سلیمان شکوہ نے اکبر آباد میں بتاریخ ۲۴ فروری ۱۸۳۸ء فرشتہ اجل کو لبیک کہا۔

۲۰ اکتوبر ۱۸۳۷ء کو شاہ نصیر الدین حیدر کو بھی زہر دے کر سن عالم شباب میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ سلطان بہو تن تنہا رہ گئیں ۱۸۵۷ء میں بہو صاحب لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں۔

جب سلطنت اودھ برٹش سرکار کی عملداری میں آگئی تو سلطان بہو کربلا معلّی چلی گئیں اور عراق میں چند سال قیام کرنے کے بعد موت نے ان کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔

(لکھنؤ سے براڈکاسٹ)

تاریخ تاج گنج آگرہ

"تاریخ تاج گنج آگرہ" ایک نایاب قلمی کتاب ہے جس کے مصنف کا نام سید عنایت علی ہے۔ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا واحد نسخہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی لکھنؤ یونیورسٹی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ ممکن ہے اس کتاب کے اور بھی نسخے موجود ہوں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس کا کوئی نسخہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ کیڑوں نے اس نسخہ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔

ابتدائی پچیس (۲۵) صفحے اور آخری پینتیس صفحے بڑی دشواری سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ لیکن نسخہ مکمل ہے۔ تحریر خوشخط اور صاف ہے۔ زبان اردو ہے اور کہیں کہیں فارسی کی آمیزش بھی ملتی ہے اردو کے ادیب اور نقادوں کے لیے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا کیونکہ اس سے اردو کی تدریجی ارتقاء پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کتاب کے مصنف سید عنایت علی، تاج محل اور اُس کی ملحقہ عمارتوں کے نگراں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی ایماء اور خواہش پر انھوں نے

بہت تحقیق اور جستجو کے بعد یہ کتاب ۱۸۳۷ء میں مرتب کی۔ چونکہ مصنف کمپنی کی ملازمت میں تھے اس لیے اس کا تذکرہ ادب اور احترام سے کرتے ہیں۔ کتاب کی ابتداء "تاج کی ملکہ" یعنی ممتاز محل کے حالات زندگی سے ہوتی ہے۔

نام ان کا بانو بیگم الخ

"تاریخ تاج گنج آگرہ" میں آگرہ اور اس کے قرب وجوار کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ نہایت تفصیل سے ملتا ہے جسے بڑی کاوش سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

"تاریخ تاج گنج آگرہ" کا موازنہ سر سید احمد خاں کی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" سے کیا جا سکتا ہے۔ آثار الصنادید میں دہلی کی عمارتوں کا حال ہے۔ ایک طرح سے ہم "تاریخ تاج گنج آگرہ" کو آثار الصنادید کا ضمیمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ سید عنایت علی نے بڑی محنت سے تمام عمارتوں کا جائزہ لیا ہے۔ عمارتوں کی پیمائش درج کی ہے اور کتبوں کی تشریح کی ہے لیکن آثار الصنادید مربوط اور سلیس انداز میں لکھی گئی ہے اور تاریخ تاج گنج آگرہ میں نہ تو وہ ربط ہے اور نہ وہ تسلسل۔ بہر نوع حقائق موجود ہیں۔ جنھیں اچھی طرح پر کھا جا چکا ہے اور جو کسی بھی سنجیدہ اور سائنٹیفک مطالعہ اور تحقیق میں معاون ہو سکتے ہیں۔ اس نسخہ میں تاج محل کے بیان میں خصوصیت برتی گئی ہے۔ مصنف نے ایک ایک پتھر، معمار، اخراجات، کتبے اور مختلف حصوں کی پیمائش بالتفصیل قلم بند کیا ہے۔

مصنف نے مغل شہنشاہوں اور شاہی خاندان کے افراد کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ خصوصاً اہمیت رکھتا ہے جہاں آخری مغل تاجداروں کا ذکر ہے کیوں کہ یہ حالات عینی مشاہدہ پر مبنی ہیں۔

سلیم ۔ مہر النساء یا نور جہاں ۔ جہانگیر کے رومان پر مصنف ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جہانگیر حسن پرست اور حد درجہ عیاش واقع ہوا تھا۔ اسکی خواہش ہوئی کہ وہ ایک پدمنی عورت سے شادی کرے ۔ اسے اطلاع ملی کہ مہر النساء ہی وہ عورت ہے جو ان تمام خصوصیات کی حامل ہے ۔ جو پدمنی میں ہوتی ہیں ۔ مصنف کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور منطقی اصولوں کے زیادہ قریب ہے بہ مقابلہ اس کہانی کے کہ سلیم اپنی شہزادگی کے زمانہ میں مہر النساء پر فریفتہ ہو گیا تھا ۔

مصنف نے نوابین اودھ کا بھی تھوڑا بہت حال لکھا ہے اور اسے نواب آصف الدولہ سے شروع کیا ہے ۔

یہ نسخہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں آگرہ کی تاریخ لکھنے کے لیے اہم مواد فراہم کرتا ہے ۔ جاٹوں ، مرہٹوں اور انگریزوں کے آگرہ پر تسلط کے حالات تفصیل سے درج ہیں ۔ مہادجی سندھیا اور دولت راؤ سندھیا کی انگریزی کیمپ میں باریابی کی تصویر کشی بھر پور طریقہ پر کی گئی ہے

اس نسخہ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں گزشتہ آگرہ کی آب و ہوا ، پیداوار ، بازاروں اور تہذیب و معاشرہ کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں ۔

چینی ظروف سازی کی چینی صنعت

فن ظروف سازی انسانی صنعت کی قدیم ترین شاخوں میں سے ہے۔ اس کا آغاز اس انسانی ضرورت سے ہوا کہ وہ کس طرح زمین کی پیداوار کو آسانی کے ساتھ اپنے منھ تک لے جائے تاکہ اس کی گرسنگی کی آگ بجھ سکے اور زندگی کا قیام ممکن ہو سکے۔ اس ضرورت کا احساس قدرت کے اوّلین قوانین میں سے ہے فنی حیثیت سے، فن ظروف سازی کا موجد اتھیس کا کورد بس تھا۔ اس کے اعزاز میں۔۔۔ حسن کے پرستار یونانیوں نے تمغے ڈھالے اور مجسمے بنائے اس فن کا ارتقا دھیرے دھیرے صدیوں میں ہوا اور آخرکار ابتدائی اقوام کے بھدے پیالوں اور کٹوروں کی جگہ بعد کی نسلوں کے چینی مٹی کے زیادہ خوبصورت اور دل کش ظروف نے لے لی جو اپنی تخلیق کے لیے زیادہ محنت اور مہارت کے محتاج ہیں۔ لیکن تمام دنیا کے چینی مٹی کے ظروف ہیں، چینی قوم کے چینی مٹی کے ظروف کا حسن و دلکشی امتیازی شان رکھتی ہے۔

چینی ظروف سازی کی تاریخ :۔

مسٹر اسٹینس لاس جولین کی رائے ہے کہ چین کی چینی مٹی کی ظروف سازی کا آغاز ۱۵۰۰ ق۔م میں ہوا۔ چین کی تاریخی شہادتوں اور قومی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں چینی مٹی کی ظروف سازی کا آغاز نہایت ہی قدیم زمانہ میں ہوا تھا۔ ان شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کی ایجاد شہنشاہ ہونگ ٹی کے عہد میں ۲۶۹۸ ق۔م میں ہوئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ چین میں چینی مٹی ظروف سازی کی ایجاد ہان خاندان کے زمانہ میں ۱۸۵ ق۔م کے مابین کسی وقت ہوئی ہے یا یوں کہئے کہ مغربی اقوام سے ۱۷۰۰ برس پہلے چینیوں نے اس فن کی ایجاد کرلی تھی۔

چینیوں نے چینی مٹی کی ظروف سازی کے فن کو راز رکھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے غیر ملک والوں کو ہمیشہ عجیب و غریب کہانیوں کے ذریعہ دھوکے میں ڈالے رکھا۔ پرتگالیوں نے میکاؤ میں اپنی پہلی نوآبادی ۱۵۱۸ء میں قائم کی اور انھیں کے ذریعہ یورپ نے پہلے پہل چینی مٹی کے ظروف دیکھے چینیوں کو PORCELAIN کا علم نہیں ہے۔ ظروف کو ٹیس۔۔ کی (TESKI) کہتے ہیں

ایک سیاح کا بیان :۔

ہمیں چینی مٹی کے برتنوں کا تذکرہ اصبر انٹی آئڈز کے سفرنامہ میں ملتا ہے جسے پیٹر اعظم نے ۱۶۹۲ء میں چین سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ چینی مٹی کے نفیس گراں قیمت اور بہترین برتن برآمد نہیں کیے جاتے اور اگر کیے بھی جاتے ہیں تو بہت ہی شاذ و نادر، خاص طور پر سنہرے ظروف جو شہنشاہ

کے استعمال کے لیے مخصوص ہیں اور جنھیں کوئی دوسرا شخص استعمال نہیں کر سکتا
ان کے یہاں ایک قسم کے قرمزی ظروف ہوتے ہیں جو بہت ہی عمدہ اور بیش
قیمت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ پکانے میں ان کی ایک بہت بڑی مقدار خراب ہو جاتی
ہے۔ برتنوں کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے ـــــ چمکدار سفید، جن کے
کناروں پر سُرخ رنگ کی جھالر بھی ہوتی ہے۔ یہ سُرخ رنگ جھالر، رنگ کو
ایک مہین جالی دار کپڑے میں رکھ کر اور پھونک کر بنائی جاتی ہے۔ برتن کی اندرونی
اور بیرونی سطح پر مساوی طور پر سُرخ رنگ کے نقطے نمودار ہو جاتے ہیں جو سوئی
کی نوک سے بڑے نہیں ہوتے۔ یہ ظروف بہت ہی بیش قیمت ہوتے ہیں کیوں کہ
ایسا کرنے میں ایک معیاری برتن حاصل ہونے کے مقابل میں سو خراب ہو جاتے
ہیں۔ اسی طرح سے وہ سونے سے بھی برتنوں کو زر کار بناتے ہیں۔ برتنوں کی
ایک اور قسم بھی ہوتی ہے جنہیں پچی کاری جیسا بھی کام ہوتا ہے۔ ایسے بھی برتن
ہوتے ہیں جن میں ہزاروں جگہوں پر درزیں معلوم ہوتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ
بغیر سمنٹ کے انھیں ایک ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ بنفشئی رنگ کے بھی کچھ
برتن ہوتے ہیں۔ جن پر سبز رنگ کے نقطے ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح بنائے
جاتے ہیں کہ رنگ کو ایک ڈھانچہ سے جس میں سوراخ ہوتے ہیں۔ پھونکا جاتا
ہے لیکن یہ عمل اتنا کم کامیاب ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے برتن کی بھی
قیمت دو سو تین سو پونڈ ہوتی ہے۔ سفید چینی مٹی کے برتنوں پر نقش یا کھدے
ہوتے ہیں یا اس کی مٹی میں اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ وہ اسی وقت نظر آتے ہیں
جب ان کو روشنی کے سامنے رکھا جائے جیسے صفحۂ قرطاس پر "آبی نشان"۔۔ یا اسے

کسی سیال سے بھر دیا جائے۔ تب وہ نقوش یا تصویریں جن کا سطح پر نشان بھی نظر نہیں آتا مثلاً " شاہی اژدر" جانور، چڑیاں یا مچھلی، سب نظر آنے لگتی ہیں۔

خصوصیتیں :۔

جہاں تک کہ چابکدستی کا سوال ہے سب سے عجیب و غریب وہ برتن ہیں جن میں جالی دار نقوش ہوتے ہیں۔ یہ جالی دار نقوش، بیرونی سطح سے الگ بالکل خارجی حیثیت رکھتے ہیں اور خاکہ کے مطابق کاٹ کر یا چھید چھید کر بنائے جاتے ہیں اور برتن کے اوپر لگا دیے جاتے ہیں۔ یہ خارجی نقوش والی سطح عام طور پر نیلی ہوتی ہے۔ اس طرح کے بنے ہوئے چھوٹے پیالے چاء یا گرم مشروب کے پینے میں استعمال ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کو ہاتھ میں پکڑنے سے انگلیاں نہیں جلتی ہیں۔

ایک اور آرائش اس طرح پیدا کی جاتی ہے کہ پھولوں، پتیوں اور گلاب کے پھولوں کے خاکوں کو مٹی میں پیوست کر دیا جاتا ہے اور خالی جگہوں کو شیشے سے بھر دیا جاتا ہے اور اس طرح وہ قریب قریب شفاف بن جاتے ہیں۔ اس کو "چاول کے دانے" کہا جاتا ہے۔ چابکدستی اور فنی مہارت کی کبھی کبھار اور مثالیں بھی ملتی ہیں مثلاً کھسکنے والی دھاریاں جنھیں برتن کے چاروں طرف گھمایا جا سکتا ہے جو اگرچہ برتن کے لیے خارجی ہوتی ہیں لیکن انھیں علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ پکانے میں کنارے قریب قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جُڑنے نہیں جاتے۔

CRACKLE
پرانے برتنوں پر ایک بہت ہی مروج آرائش ہوتی تھی جس کو "دراز" کہتے ہیں۔ اس کے بنانے کا طریقہ بالکل راز رکھا جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ برتن

کی بیرونی سطح پر غیر منظم خطوط ہیں۔ "درزوں" کا ایک سلسلہ ہوتا ہے کبھی کبھی "درز" کو لال رنگ سے بھر دیا جاتا ہے۔ جب نقاشی بہت باریک ہوتی ہے تو فرانسیسی زبان میں چھوٹی قسم کو ترد۔ تی اور بڑی قسم کو کرے کلیس کہتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں شیشہ میں دراز نظر آتی ہے اور دیکھنے میں برتن بالکل پتھر کا معلوم ہوتا ہے جس میں کثرت استعمال سے نشانات یا درازیں پڑ گئی ہوں، لیکن غور سے دیکھنے پر سطح بالکل چکنی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ رگوں کی طرح جو لاتعداد درازیں ہیں وہ شیشہ اور مسالہ میں موجود ہیں نہ کہ سطح پر ...... "چینی پوست بیضہ EGG-SHELL" کی وجہ تسمیہ اس کی نزاکت اور سبک پن ہے۔ حالانکہ ساخت بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ پھر بھی اس ساخت کے بڑے بڑے برتن بنتے ہیں۔ عام طور پر ان پر خوبصورت نقاشی ہوتی ہے۔ اس ساخت کی پلیٹوں کی پشت پر عموماً ارغوانی حاشیے ہوتے ہیں۔

برتنوں پر تصویریں اور آرائش بہت سی حالتوں میں علامتی ہوتی ہے۔ جن سے ہم چینیوں کے فلسفہ اور فلسفہ مابعد الطبعیات کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ جیسا کہ قدیم چینی مخطوطات سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں کے یہاں علامتی رنگ پانچ ہوتے ہیں۔ بنیادی رنگ جو عناصر خمسہ (آب، آتش خاک، معدنیات، چوب) اور جہات اربعہ سے متعلق ہیں یہ ہیں۔ سرخ رنگ آتش کا علامتی نشان ہے۔ اور جنوب کو ظاہر کرتا ہے۔ سیاہ رنگ زمین کی علامت ہے اور شمال کو ظاہر کرتا ہے۔ سبز رنگ چوب کو ظاہر کرتا ہے اور

مشرق کی علامت ہے۔ سفید رنگ دھات کی علامت ہے اور مغرب کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز "آتش" کو دائرہ سے اور "آب" کو اژدھے کی تصویر۔
(جب برتنوں پر اژدھے کی تصویر بناتے ہیں تو اظہار مراتب کے لیے یہ فرق ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو برتن شہنشاہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں ان میں اس تصویر میں پانچ چنگل اور جو شہزادوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ان میں چار چنگل اور جو برتن تجارتی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں ان پر جو اژدھے کی تصویر ہوتی ہے اس میں تین چنگل ہوتے ہیں) ہے اور پہاڑوں کو ہرن کی تصویر سے ظاہر کرتے ہیں۔
چڑیوں، چوپائیوں اور رینگنے والے جانوروں کی اصل تصویریں بناتے ہیں
چینی ظروف سازی جیسی انوکھی صنعت جو دیومالا اور رومانویت سے بھرپور ہے۔ موجودہ تہذیب کی میکانکی اور سادہ صنعت کے مقابلہ میں ختم ہو چکی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم جب کسی چینی برتن کے نادر نمونے کو دیکھتے ہیں تو ہم اپنے جذبہ تحسین و تعجب پر قابو پانے میں ناکام رہتے ہیں۔

———— ٭٭٭ ————

خیام کا نظریہ حیات

یا بادہ نشیں کہ ملک محمود این ست در چنگ شنو کہ لحن داؤد این است
از آمدہ و رفتہ دگر یاد مکن حالے خوش باش زاں کہ مقصود این است

عمر خیام تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کی ولادت خراساں کے شہر نیشاپور میں گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اور وفات بارہویں صدی عیسوی کے ربع اوّل میں ہوئی تھی۔ وہ اس گوشۂ گمنامی، جو اس کے لیے بظاہر مقدر ہو چکا تھا، سے نکل کر عظمت اور ہر دلعزیزی کی بلند چوٹی پر پہونچ چکا ہے آج خیام کے پرستار بلاقید مذہب و ملت ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں، اس کی پرستش ایک ایسے پیمبر کی حیثیت سے، جس نے "بخور و بنوش و خوش بزی" کے نظریہ کی تبلیغ کی، کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو اپنی ذاتی کشش رکھتا ہے۔ اور بہت سی جہتوں میں از حد عملی ہے۔

"زندگی اور دنیا سے متعلق خیام کا نظریہ بحث و نظر کا موضوع رہا ہے۔ دین و

حکمت کے مختلف مذاہب کے پرجوش حامی افراد خواہ مخواہ خیام کو اپنے اپنے گروہ میں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ تو اس کو ایک اعلیٰ پایہ صوفی سمجھتے ہیں، کچھ اس کو ایک متشرع مذہبی آدمی قرار دیتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ خیام ایک نہایت لذت پرست انسان تھا جس کا مذہب اور فلسفہ سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جو شراب اور عورت سے اپنے نفس کو موٹا کرتا تھا۔ غیر جانبدار ناقدین اس کے بارے میں کوئی اثباتی رائے نہیں پیش کرتے۔ وہ ایک شاعر تھا اور شاعر کے سوا کچھ نہ تھا وہ اپنی شاعرانہ تخیل کی پرواز میں، مختلف اوقات اور مختلف حالات میں جو کچھ محسوس کرتا تھا اسے سپرد قلم کر دیتا تھا۔ اس کے یہاں ایک "باقاعدہ" خیالات کا "نظم" تلاش کرنا بے سود ہے لیکن اگر جذبات سے الگ ہو کر اس کی رباعیات کا مطالعہ کیا جائے تو خیام کی "انسانیت" اور اس کا فلسفہ روشنی میں آجاتا ہے۔

جیوں جیوں خیام اپنے "نجی فلسفہ حیات" کی وضاحت کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اس میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیام دنیا اور دنیوی جاہ و حشم کی بے ثباتی پر زہر اگلتا ہے وہ حال پر زور دیتا ہے وہ شراب کو، جو اس کے نزدیک "ہمہ دان" ہے خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور دنیاوی بکھیڑوں کو ناقابل اعتنا قرار دیتا ہے۔

خیام یہ نصیحت کرتا ہے کہ حال کو غنیمت سمجھو اور مردہ ماضی جو واپس آنے والا نہیں اس کے لیے کڑھنا بیکار محض ہے مستقبل پر وہ غیب میں مستور ہے اور کوئی شخص بھی پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ پردہ غیب سے کیا ظہور میں آنے والا ہے دوراندیش اور محتاط حضرات اس نصیحت کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن خیام جانتا ہے کہ ناگہانی حادثات انسانی زندگی کا رخ متعین کر دیتے ہیں۔ عمر بہت ہی مختصر ہے۔ اس لیے

وہ اس سے بلا توقف زیادہ سے زیادہ مستفید ہونا چاہتا ہے۔

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن
فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
برنامدہ و گذشتہ بنیاد منہ
حالے خوش باش و عمر برباد مکن

امروز ترا دسترس فردا نیست
اندیشۂ فردات بجز سودا نیست
ضائع مکن این دم ار دلت شیدا نیست
کیں باقی عمر را بہا پیدا نیست

بظاہر خیام حظوظ نفسانی اور لہو و لعب سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن فلسفی اور انسان کی حیثیت سے اس کے کلام میں ایک گہری اور موثر سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ خیام تضاد کا شکار نہیں ہے اور نہ وہ عجلت میں کوئی قاعدہ کلیہ پیش کرنا پسند کرتا ہے وہ مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے، بحث و نظر سے کام لیتا ہے اور تب نتیجہ نکالتا ہے۔ وہ نتیجہ ہی اس کا مذہب ہوتا ہے۔ اور اس کے پرستاروں کے لیے رکن ایمان، جس کو وہ تقریباً دینی کتاب کی طرح مقدس سمجھتے ہیں۔

خیام کہتا ہے ؎

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت
ترسندۂ دوزخ است و جویائے بہشت
آں کس کہ ز اسرار خدا باخبر است
زیں تخم در اندرونِ دل ہیچ نکشت

ہمارا یہ فلسفی صداقت، آخری صداقت کا متلاشی ہے اور کوئی شخص بھی اس کی ایماندارانہ سعی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اسے مذہب و فلسفہ کے ائمہ، جو اس زمین پر دیوتا کی حیثیت رکھتے ہیں، کے آستانوں پر سکون میسر نہیں

آتا اور تب وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے ؎

یکتائے درے کہ درکشائندہ توئی
بنمائے رہے کہ رہ نمایندہ توئی

من دست بہ ہیچ دستگیرے ندہم
کیں کاں ہمہ فانی اند و پایندہ توئی

مذہب عبارت ہے عقیدہ اور کورانہ تقلید سے۔ عقل کی میزان میں اس کو تولنا حماقت ہے۔ مشیت ایک متجسس دماغ کو ایک ایسے عقیدہ سے مطمئن کرنا چاہتی تھی جس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بے چون وچرا عقیدہ کا مطالبہ انسان اور انسانی دماغ کی فطرت کے بالکل برعکس ہے۔ خیام کائنات اور خالق کائنات کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن اُسے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ کسی نے اس سے سرگوشی کی کہ انسانی عقل محدود ہے۔ انسان ایک محدود وجود ہے اس کے لیے اس لامحدود خدا کو جو عقل اعظم ہے۔ جان لینا ناممکن ہے۔ اس نے واضح طور پہ انسانی عقل کی بے مائیگی کو دیکھا اور "خشک عقل" کو طلاق دیدی۔ خیام نے خدا سے بغاوت نہیں کی بلکہ مشیت ایزدی اور تقدیر خداوندی میں اس کا عقیدہ پختہ تر ہو گیا ؎

ہر چند دلم ز علم محروم نشد
کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد

اکنوں کہ بروئے کار در می نگرم
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

تا کے ز چراغ مسجد و دود کنشت
تا کے ز زیان دوزخ و سود بہشت

رو بر سر لوح بیں کہ استاد قضا
اندر ازل آنچہ بودنی بود نوشت

خیام کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔ وہ محض ایک کٹھ پتلی ہے۔ جو دنیا کے اسٹیج پر دوسروں کے اشارہ پر رقص کر رہی ہے

گناہوں پر غمزدہ ہونے، دل شکستہ ہونے یا توبہ کی کوئی وجہ نہیں۔ خیام ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ ہمیں تسلی دیتا ہے "برخیز و خوش باش" اور کہتا ہے ؎

یزداں کہ گِل وجود ما آراست | دانست زفعل ما چہ برخواہد خاست
بے حکمش نیست ہر گناہے کہ مراست | پس سوختن قیامت از بہر چراست

خیام نے جدوجہد کی اور ناکام رہا لیکن اس کی ناکامی جانب راست تھی خیام نے ان باتوں کو، جس کو دوسرے لوگ چھپاتے ہیں اور مشتبہ بنا دیتے ہیں جرأت کے ساتھ صاف صاف کہہ دیا اور راز رکھنے کی کوشش نہ کی اور لوگ اندھیرے میں سراب کے پیچھے سر ٹکراتے ہیں جو قطعاً ناقابل حصول اور ناقابل فہم ہے ذات خداوندی کے ادراک کا مسئلہ اب بھی لاینحل ہے۔ خدا، جس سے ہماری عقیدت وابستہ ہے جس کی ہم پرستش کرتے ہیں اور جس سے ہم ڈرتے ہیں وہ ہمارے لیے ابھی لامعلوم ہے۔ خدا صداقت ہے اور صداقت خدا۔ خیام صداقت شعاروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے یقین کی پوری طاقت کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ صداقت کا نہ تو احاطہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا تجزیہ ہی ممکن ہے ؎

کس را پس پردہ قضا راہ نشد | وز سر خدا ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند | معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

دیوا شریف کا درویش

یوں تو ہندوستان میں بہت سے مقدس مقامات ہیں جن کو مسلمان قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن دیوا شریف حال ہی میں بہت بڑی زیارت گاہ بن گیا ہے اجمیر اور غیاث پور دہلی کی طرح اس مقام کا تقدّس بھی زائرین کو ہندوستان کے کونے کونے سے کشاں کشاں لے آتا ہے۔ دیوا ضلع بارہ بنکی کا ایک دور افتادہ قصبہ ہے جہاں ایک پرانے قلعہ کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں یہاں کی آبادی کا بیشتر حصّہ مسلمانوں پر مشتمل ہے

کہا جاتا ہے کہ اس قصبہ کو گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے آباد کیا دیوا کے آباد کاروں میں شاہ دانش جو فوج کے کمانداروں میں سے تھے اور امیر حسن حجّاج بغدادی کا نام سرفہرست ملتا ہے یہ قصبہ جس کو ابو الفضل کی تصنیف آئین اکبری کے مترجم جیرٹ نے غلطی سے صوبہ کہہ دیا ہے در اصل اکبر کے دور حکومت میں پرگنہ کا صدر مقام تھا جس کی پوری آمدنی مبلغ ۱۶,۰۹۲۳ دام تھی۔ نوابین اودھ کے زمانہ میں بھی دیوا مسلم درس و تدریس

کا گہوارہ تھا اور مٹی کے برتنوں اور شیشہ گری کے لیے خاصی شہرت کا مالک تھا۔ اودھ کی بادشاہت کے سلب کیے جانے اور پھر بائیس راجپوتوں کے پے در پے حملوں سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے اقتدار چھن گیا نہ جانے کتنی مردم خیز بستیاں تباہ و ویران ہو گئیں ان میں سے ایک دیوا بھی تھا۔ جو پچھلی صدی میں گوشۂ گمنامی میں چلا گیا۔ وہ بستی جس کو دنیا قطعی طور پر فراموش کر چکی تھی یک بیک تقسیم ہند کے بعد مسلم اجتماع کا اہم مرکز بن گئی اس لیے کہ دیوہ شریف کو مشہور زمانہ صوفی بزرگ حضرت حاجی وارث علی شاہؒ کا مدفن ہونا نصیب ہوا۔

حضرت کی ولادت ۱۸۱۴ء۔۱۹ سنہ کے درمیان ہوئی تھی ابھی وہ خورد سال ہی تھے کہ والد ماجد کے سایہ سے محروم ہو گئے اس کے بعد آپ کی پرورش آپ کے بہنوئی اور اپنے زمانہ کے جید عالم حاجی سید خادم علی شاہ نے کی جو بعدہٗ آپ کو اپنا سجادہ نشین مقرر کر گئے۔ حاجی وارث علی شاہؒ کی عمر کا بیشتر حصہ مسلم ممالک کی سیاحت میں صرف ہوا۔ اس مدت میں ان کو دس بار حج کی سعادت نصیب ہوئی وہ سلطان ترکی امیر المومنین عبد المجید اول ۱۸۶۱ء سنہ ۱۸۳۸ء سے استنبول میں اور جرمنی کے شہرۂ آفاق چانسلر پرنس بسمارک سے برلن میں ملے اس کے علاوہ ہندی مسلمانوں کے سربراہ سرسید احمد خاں سے بھی علی گڑھ میں ملاقات کی گو کہ ان کی ان تاریخی ملاقاتوں کے حالات ہنوز پردۂ گمنامی میں ہیں، مگر حضرت کی اس وقت کی اہم ترین برطانیہ دشمن یورپی شخصیتوں سے تبادلۂ خیالات واقعی از حد پر اسرار ہے اور اپنے اندر خاصی معنویت رکھتا ہے کیوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان قوم حاکم نہ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے عنانِ سلطنت تو کبھی کی چھن چکی تھی لیکن اس کا رہا سہا اقتدار بھی اودھ کی تباہی کے ساتھ ساتھ

۱۸۵۶ء میں رخصت ہو گیا تھا یہ سب اس وقت ہوا جب کہ پوری کی پوری قوم خواب غفلت میں خراٹے لے رہی تھی۔ اور جب آنکھ کھلی تو حالات بدل چکے تھے محکومیت کا طوق گلے میں پڑ چکا تھا اس پر پوری قوم جھنجھلا اُٹھی اور پھر حالات سے لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی اس عظیم جد و جہد کو محض ناکام غدر کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے ساتھ ساتھ دلّی سے آخری مغل تاجدار، جو مسلمانان ہند کی نظر میں اسلامی حکومت اور سیاسی اقتدار کا مظہر تھا جلاوطن کر دیا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندی مسلمان ادبار اور سراسیمگی کے دور سے گذر رہے تھے اور اب بھی اقتدارِ باستاں کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان حالات میں حضرت شیخ کا بیرونی ملکوں میں مسلمانانِ ہند کا غیر سرکاری ترجمان بن جانا کوئی محال بات نہیں۔

۱۸۹۹ء میں حاجی وارث علی شاہ آخری طور پر دیوا میں مقیم ہوئے لیکن پند و نصائح کا یہ سلسلہ صرف چھ سال تک جاری رہ سکا کیونکہ آپ کی وفات، ۱۹۰۵ء اپریل میں ہو گئی۔ اتنے قلیل عرصہ میں بھی آپ کے عقیدتمندوں کی تعداد ایک بیان کے مطابق چار لاکھ تک پہنچ گئی جو قرین قیاس نہیں ہے۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ آپ کے نام لیوا اور مرید غیر ممالک کے باشندے بھی تھے۔ حضرت موصوف نے اسلامی فقہ اور علوم میں کبھی اجتہاد کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انھوں نے مباحثوں اور مناظرہ میں کوئی حصہ لیا لیکن ان کی نفس کشی اور کردار کی بلندی ان کو اولیائے کرام کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ ان کے زہد و تقویٰ اور قناعت کا عالم یہ تھا کہ ابتداء میں ہفتہ کے چھ دن روزے رکھتے تھے بعد میں ضعیف العمری کے باعث اتنی طاقت نہ رہ گئی تھی

پھر بھی ہفتہ میں چار روز سے کم روزے کبھی نہیں ہوئے انھوں نے اپنے کو ازدواجی بندھنوں سے مطلق آزاد رکھا اور تمام عمر تجرد میں گزار دی۔ حاجی صاحب نے اپنے آپ کو ہر ممکن لہو و لعب سے دور رکھا محض ایک بے سلی چادر (احرام) ہی نے آپ کی ستر پوشی کی۔ حضرت ہمہ وقت عالم محویت میں رہا کرتے جس کو بھی ان سے قربت نصیب ہوئی آپ کو مراقبہ اور عالم استغراق میں پایا

آپ کی تعلیمات :-

حضرت شاہ وارث علیؒ ذات پات کے قائل نہ تھے۔ ان کی تعلیمات کی اساس عشق حقیقی پر ہے جو ابدی سکون کا راستہ ہموار کرتا ہے وہ مذہب سے متعلق جملہ رسوم و مظاہر سے آزاد تھے۔ ان کے نزدیک زنّار کے پھندے اور تسبیح کے حلقے خدا تک پہونچنے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ دیر و حرم کے تماشے صرف انھیں کو مرعوب ہوتے ہیں جن میں بصیرت کا فقدان ہے۔ ان کے قول کے مطابق من و تو کا فرق اگر اٹھا دیا جائے تو جدھر نظر اٹھے گی خدا کا جلوہ نظر آئے گا اس کے نزدیک ہندو و مسلمان ایک ہیں۔ خدا کے سچّے بندوں کو نہ تو دوزخ کا ڈر ہے اور جنّت کی ہوس۔

چنانچہ جب بھی کوئی غیر مسلم آپ کی خدمت میں برائے ہدایت پہونچتا آپ اس کو تبدیلی مذہب کے بجائے نجاست اور آلودگی سے بری ہونے کی تلقین فرماتے اور کردار کی بلندی پر زور دیتے۔ ہندوؤں کو بُت پرستی سے احتراز کرنے کی ہدایت فرماتے اور برہما کے حلقہ بگوش ہونے کو کہتے جو قادرِ مطلق ہے صوفیائے کرام کے نزدیک وجدان حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک باطنی

اور دوسرا ظاہری پہلے طریقہ میں فرد اپنے نفس میں ڈوب کر اپنے دل کی گہرائیوں میں ذات مطلق کا جلوہ دیکھتا ہے اس لیے کہ آتما ہی میں پرماتما ہے۔ دوسرے طریقہ میں جزو میں کل کو تلاش کرنا ہوتا ہے اس وحدت کو پالینا ہوتا ہے جو کثرت میں پنہاں ہے۔ حضرت نے تمام مظاہر سے نجات حاصل کر کے اپنی کیف و مستی سے اپنی روح اور ذات کو منور کر لیا تھا اور اپنے معبود کو پالیا تھا جو خود ان کے دل میں مکین تھا۔ لیکن ہمہ اوست پر ان کا اصرار اور ان کی تعلیم کہ مسجد، مندر اور کلیسا میں رہنے والا خدا وہی ایک ہی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قادر مطلق تک پہونچنے کے لیے ہر راستہ آپ کے لیے آسان ہو گیا تھا۔

آپ کا حلقۂ ارادت:-

حضرت وارث علی شاہؒ کی یہ رواداری اور بلند نظری غیر مسلم افراد کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ٹھاکر پنچم سنگھ، یو پی پولس سروس کے مسٹر جانسٹن ایک اسپینی النسل سانٹا کلارا کے کاؤنٹ گلزرا اور ایک پارسی جن کا نام بدقسمتی سے معلوم نہ ہو سکا وہ غیر مسلم اصحاب تھے۔ جو آپ کے حلقہ بگوش ہوئے۔ ٹھاکر پنچم سنگھ جو ملوالی ضلع مین پوری کے باشندے تھے اپنی تمام جائداد حضرت کی درگاہ کے وقف کرنے کے بعد دنیا ترک کر دی اور رہبانیت اختیار کر لی کاؤنٹ گلزرا جنھوں نے کمیونسٹ غلبہ کے بعد اپنے وطن کو ترک کر دیا تھا اپنی جائداد و نقدی ایک وصیت کے مطابق درگاہ شریف کے لیے وقف کر دی۔ کاؤنٹ موصوف جو کسی وقت کلکتہ کے سینٹ پال کالج کے پروفیسر رہ چکے تھے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۳ء میں قانون کے ایک مسلم طالب علم شیخ حبیب احمد کی زبانی حضرت کے عقائد سے متعارف ہوئے اور غائبانہ طور پر انہی کے ہو کر رہ گئے۔ ابتداء میں وہ مصر آئے اور حسین عسکری نامی

ایک شخص سے عربی زبان سیکھی۔ قاہرہ کے قریبی ریگزار میں عزلت نشین ہوئے بعدہٗ ناموراناامی جہاز میں سوار ہوئے اور بمبئی پہونچے اور پھر عازم دیوا ہوئے جیوں ہی گرد سے اٹی گاڑی ایک آخری ہچکولے کے ساتھ آستانہ کے سامنے رکی، ایک فرشتہ صورت، ضعیف و نحیف شخصیت کاؤنٹ کا خیر مقدم کرنے کے لیے دروازے سے آگے بڑھی، معانقہ کے لیے ہاتھ خود بڑھ گئے اور دونوں اتنی گرم جوشی سے ملے کہ حاضرین کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں کی پہلی ملاقات ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ اس ملاقات کی روداد کاؤنٹ گلرزا ہی کی زبانی سنی جائے۔

"دو مریدوں کا سہارا لیے بلند قامت درویش وارث علی شاہ نمودار ہوئے۔ نیلی نیلی آنکھیں آسمان کی طرح شفاف تھیں اور ان میں گہرائی تھی، فراخ اور چوڑی پیشانی، کھڑا نقشہ، سرخ و سفید رنگ اور نورانی ریش مبارک، الھڑ جوانوں جیسی معصوم اور بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پہ کھیلتی ہوئی ان سب کا مجموعہ تھی حضرت کی شخصیت، میں از خود ان کی طرف تیزی سے کھنچا چلا گیا۔ انھوں نے مجھ کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور پھر میں نے جو کلمے حضرت کے منھ سے سنے وہ تھے "محبت، محبت"۔ یعنی عشق حقیقی اسی کو کہتے ہیں۔ پھر شیخ نے پوچھا کہ میں اور کیا کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرا جواب تھا کہ "آپ کا بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ اس پہ شیخ نے ارشاد فرمایا

"ہم دونوں وہاں ایک جگہ ہوں گے۔" کاؤنٹ نے حضرت کی عطیہ پوشاک زیب تن کی اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ دوسرے دن وہ بمبئی روانہ ہوئے اور اسی جگہ سے مصر واپس ہوئے۔

یہ اچانک اور ڈرامائی ملاقات اور پھر اتنی جلد واپسی کسی غیر متوازن ذہن کی پیداوار نہ تھی اس ملاقات سے بہت پیشتر کاؤنٹ گلرزا کو حضرت سے قلبی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ دیوا شریف سے واپسی کے بعد کاؤنٹ حضرت کا عطیہ جوش عقیدت میں اپنے تکیہ کے نیچے ہمہ وقت رکھتا تھا اور استراحت کے قبل اس کو ضرور چومتا تھا۔ کاؤنٹ کا کہنا تھا کہ "آہستہ آہستہ میرے ذہن سے شیخ کا تصور مٹتا گیا اور اس کی جگہ اسی حقیقت کاملہ نے لی جس کا کہ میں ایک زمانہ سے متلاشی تھا" واقعی روحانیت اور کیف و مستی کے میدان میں گلرزا اور شیخ کی ملاقات بہت بڑی روحانیت رکھتی ہے۔

درگاہ شریف

دیوا شریف میں حاجی وارث علی شاہؒ کا مزار مبارک سادہ مگر پرکار ہے اور تمام تر اینٹ گارے کا بنا ہے مزار شریف کی تعمیر چندے اور ان اوقاف کی آمدنی سے ہوئی ہے جو درگاہ کے لیے وقف ہیں۔ صرف ٹھاکر پنچم سنگھ کی وقف کردہ جائداد سے دو ہزار کی آمدنی ہوتی ہے مقبرہ کی وضع اور اس کے تینوں حصے یعنی کرسی، مرکزی کمرہ اور گنبد کے تناسب پوری عمارت کو ایک قسم کا نسوانی وقار بخشتے ہیں۔ چھتے دار مرکزی ہال میں شیخ کی آرام گاہ ہے جس کے گرد بارہ مرمریں کھمبوں پر مشتمل ایک کٹہرا ہے۔

حاجی وارث علی شاہؒ نے ایک غریب گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور تمام عمر قناعت اور زہد و تقویٰ میں گذار دی وفات کے بعد بھی ایک سادہ سی آرام گاہ ملی اور وہ بھی ایک دور افتادہ گاؤں میں اگر یہ ان کی روحانیت کی کشش نہیں تو اور کیا ہے کہ سیکڑوں اور ہزاروں انسان مذہب اور رسم و رواج کے بندھن توڑ کر آپ کی چوکھٹ پر کھنچے چلے آتے ہیں اور ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

شرقی فنِ تعمیر

ہندو ۔ مسلم طرز کا حسین امتزاج

تیمور صاحب قراں کے حملے کی تاب دلّی کی مرکزی سلطنت نہ لا سکی تیمور کے واپس جانے کے بعد ملک میں انراج پھیل گیا اور پورے ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ مرکزی شہنشاہیت کے نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بجا طور پر ہندوستان کا تاریک عہد کہا جاتا ہے لیکن اگر اسی دور کو جملہ فنون اور خصوصی طور پر فن تعمیرات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہی زمانہ نہایت تابناک ہے۔ اس ضمن میں سنہ ۱۴۰۰ء کو جب ہندوستان چھوٹی چھوٹی خود مختار اور آزاد مملکتوں میں بٹ گیا تھا، ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے حکمرانوں نے اپنے لیے الگ الگ ایک مخصوص طرز تعمیر جو دلی کے مروجہ شاہی طرز تعمیر سے بالکل الگ ہے اپنایا جس طرح ان صوبائی حکمرانوں نے دلی کی مرکزیت سے بغاوت اور سرکشی کی تھی ٹھیک اسی طرح ان کا اپنایا ہوا طرز تعمیر بھی مرکز سے قطعی طور پر منحرف ہے۔ ان کی بغاوت اور سرکشی انکی بنوائی ہوئی عمارات کی ایک ایک اینٹ سے

ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ حالات دیر پا نہ رہ سکے کیوں کہ جلد ہی مغل فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ان سب ڈھائی اینٹ کی مسجدوں کو ڈبو کر اپنے لیے ایک نئے طرز تعمیر کی بنا ڈالی۔ پھر بھی صوبائی فن تعمیرات کو محض اس لیے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس کا زمانہ قلیل ہے بلکہ اس دور کو ہندوستان کی فنِ تعمیرات کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے جس کا مطالعہ کسی بھی لحاظ سے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

جونپور کا شہر

تیمور کے حملے سے پیدا شدہ لامرکزیت نے جس قابل ذکر مملکت کو جنم دیا وہ "شرقی سلطنت" تھی جس کا دارالخلافہ جونپور تھا۔ جونپور کا شہر سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۶۰-۱۳۵۹ء میں آباد کرایا تھا جب وہ جونپور سے چار میل جنوب مغرب میں دریائے گومتی کے جنوبی کنارے پر ظفر آباد میں خیمہ زن تھا۔ یہ شہر اس نے اپنے چچا زاد بھائی شہزادہ جونا کی یاد میں آباد کیا تھا، جس کو تاریخ محمد تغلق کے نام سے جانتی ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ اس نئے شہر کی بنیاد کسی قدیم ہندو دور کے شہر کے کھنڈروں پر رکھی گئی تھی جونپور دہلی کی شہنشاہیت کے لیے ہمیشہ سپر کا کام کرتا رہا اور آخر میں شرقی سلاطین کے عہد میں ایک آزاد خودمختار ریاست کا پایۂ تخت بن گیا۔

خاندان شرقیہ

شرقی خاندان کا بانی خواجہ جہاں نامی ایک خواجہ سرا تھا جس کا اصلی نام ملک سرور تھا اور اس کو فیروز شاہ تغلق کے جانشین محمود تغلق نے اپنی سلطنت کے مشرقی علاقہ کا گورنر مقرر کیا تھا اور "ملک الشرق" کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس سے پہلے ملک سرور کو سالار رجب نے اپنے پوتے محمود تغلق کی خدمت کے لیے مقرر کیا تھا

خواجہ جہاں نے جونپور کو اپنی قیام گاہ کی حیثیت دی اور ۱۳۹۴ء سنہ میں مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خودمختار بن بیٹھا۔ اس کی موت (۱۳۹۹ء سنہ) کے بعد خواجہ جہاں کے متبنیٰ مبارک نے جونپور کا تخت و تاج سنبھالا اور پہلے پہل "سلطان الشرقی" کا لقب اختیار کیا۔ اس کی موت کے بعد اس کا چھوٹا بھائی شمس الدین، ابراہیم شاہ شرقی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ جونپور کی مختصر سی تاریخ میں ابراہیم شاہ بہت اہم درجہ رکھتا ہے۔ اس کے انتیس (۲۹) سالہ دورِ حکومت میں شمالی ہندوستان کے سب سے زیادہ زرخیز علاقہ میں شرقی حکومت مستحکم ہوگئی اور شرقی سلاطین کا سکہ قنوج سے بہار اور بہرائچ سے اٹاوہ تک چلنے لگا۔

ابراہیم شاہ شرقی کو اپنا پایۂ تخت شاندار، بارونق اور علم و حکمت کا مرکز بنانے کی ہمیشہ سے تمنا تھی چنانچہ اُس کے دَور میں جونپور کو صحیح معنوں میں وہی حیثیت حاصل رہی جو کبھی بغداد کو میسر تھی۔ اس زمانہ میں جونپور جملہ علوم و فنون کا سرچشمہ بن گیا تھا۔ اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پوری نویں صدی ہجری تک رہی جب تک شرقی خاندان کا چراغ روشن رہا۔

جونپور کی عمارتیں

جونپور کی عمارتیں صرف مساجد پر مشتمل ہیں یا یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ شرقی عمارات میں سوائے مسجدوں کے اور ہر چیز خاک میں مل چکی ہے۔ سلاطین شرقیہ میں تخریب کا جذبہ بھی اتنا ہی شدید تھا جتنا کہ تعمیر کا۔ انھوں نے جونپور کی ہر قدیم چیز کو منہدم کرا کے اپنی عمارات کی داغ بیل ڈالی۔ ساتھ ہی ساتھ جونپور ہی ہندوستان کا وہ واحد مسلم شہر ہے جو خود مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوا۔ شاہ حسین

شرقی خاندان کے آخری فرماں روا (۷-۱۴۵۲ء) کی شکست کے بعد لودیوں نے شدید انتقام کے جذبہ میں آکر جونپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اپنے حریف کے آخری نشانات کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹادیا حتیٰ کہ ان کی دست و برد سے مسجد وں کے دروازے بھی نہ بچ سکے۔ شاید مذہبی پیشواؤں کی مخالفت اور عتاب کے ڈر سے لودی فاتحین کو شرقی مساجد کو معاف کر دینا پڑا۔ چنانچہ شرقی محلات کے کھنڈروں کا اب نشان تک باقی نہیں ہے۔ صرف شرقی فنِ تعمیر کی عظمت کی نوحہ خوانی کے لیے اس دور کی مسجدیں ہی باقی رہ گئی ہیں

جونپور کا قلعہ

شرقی عمارات کا تذکرہ کرنے سے پہلے جونپور کے فیروز شاہی قلعہ کا ذکر یقیناً برمحل ہوگا۔ اس قلعہ کی مسجد اور حمام فیروز شاہ کے بھائی ابراہیم باربک کے بنوائے ہوئے ہیں۔ یہ قلعہ سابق کرار کوٹ کے کھنڈر پر دریائے گومتی کے شمالی کنارے پر بنا ہے چوکور مگر بے ترتیب ہے۔ اس کی سنگی دیواریں مصنوعی طور پر بنے ہوئے مٹی کے "دمس" کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ صدر پھاٹک اب بھی نیم منہدم حالت میں موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو اکبر نے بنوایا تھا۔ پھاٹک کی محراب اور چوکھٹ کے مابین مثلثوں میں نیلی و دھانی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اور دیواروں کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے خوبصورت طاقوں سے مزین کیا گیا ہے۔

ابراہیم باربک کا بنوایا ہوا حمام ترکی حماموں جیسا ہے۔ اس کی عمارت کا زیادہ حصہ زمین کی موجودہ سطح سے کافی نیچا ہے۔ اس عمارت کے خدوخال ہماری توجہ کو جس قدر طلب کرتے ہیں اتنی ہی اس کی وسعت بھی۔

قلعہ میں ابراہیم باربک کی مسجد جونپور کی اوّلین اور بنگالی طرز پر طویل اور تنگ عمارت ہے جو صرف ہندو وضع، منقش اور پُر کار کھمبوں اور محرابوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ مسجد کی چھت پر تین چھوٹے اور نیچے گنبد ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسجد کی عمارت پر کوئی مینار نہیں ہے۔ کچھ فاصلہ پر پتھر کے ۲ دو ستون تھے جن میں اب صرف ایک ہی باقی رہ گیا ہے مگر ایک ٹوٹا ہوا ہم شکل چبوترہ دوسرے کھمبے کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن جونپوری قلعہ کا شمار وہاں کی نمایندہ عمارات میں نہیں ہوتا

جونپور کی مسجدیں

شرقی دور کی پر شکوہ مسجدوں کے حسن کا انحصار طرز تعمیر، وضع اور کام میں لائے جانے والے مسالوں کی تزئین پر ہے۔ نہ کہ بیش بہا سنگ مرمر اور خیرہ کن رنگ و روغن پر۔ ان کی انفرادیت ظاہری چمک دمک کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ ان کا اچھوتا اور انوکھا پن ان کو ایک الگ طرز تعمیر کا نمایندہ بناتا ہے اور آج بھی سیاحوں کو کشاں کشاں جونپور لے جاتا ہے۔ شرقی مساجد تمام کی تمام پتھر، چونے، گارے اور کنکریٹ سے بنی ہیں گارے اور اینٹوں کی دیواروں پر تراشے ہوئے چوکور پتھر انتہائی صفائی اور چابک دستی سے جوڑے گئے ہیں۔ مسجدوں کے اندرونی کھمبے، چھتیں اور گنبد، کُل کے کُل پتھر کے ہیں جب کہ ان کے باہری حصوں پر پلاسٹر کیا ہوا ہے۔ اندرونی حصوں کی آرائش اور زیبائش کے لیے سنگ مرمر کا خال خال استعمال ہے۔ اٹالہ مسجد کے بارے میں فرگوسن (FERGUSSON) کے ایک مضمون سے جونپوری طرز تعمیر کے متعلق بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے فرگوسن کے خیال میں "یہ مسجد ایک صحن پر مشتمل ہے جس کے مغرب میں عبادت خانہ کی خاص عمارت کا

ملبہ ہے۔ وسطی عمارت پر ایک گنبد ہے جس کے سامنے مصری اہرام کی شکل کا پھاٹک ہے۔ یہ پھاٹک اپنی بلند قامتی سے مینار کا کام بھی دیتا ہے اس پھاٹک کی وضع مصری معبدوں کے دروازوں (PROPYLON) کی طرح ہے یہ عظیم محراب اٹالہ مسجد کی انفرادی خصوصیت ہے۔ صحن کے تینوں کناروں پر غلام گردشیں ہیں جو خانقاہ کا کام دیتی ہوں گی ان عمارتوں کے وسط میں خوشنما محرابیں ہیں۔ جونپوری طرز تعمیر کے یہ نمونے بے مثال ہیں اور اپنی سادگی سے حسن پیدا کرتے ہیں ان عمارات کی دیواریں ڈھلواں ہیں جن کی موجودگی سے عمارات کی پائداری، مضبوطی اور عظمت کا احساس ہوتا ہے"

اٹالہ مسجد

اٹالہ مسجد جونپور کی شرقی طرز تعمیر کا اولین اور بہترین شاہکار ہے۔ یہ مسجد سب سے خوبصورت اور پُرکار عمارت ہے اور اس وقت بھی اچھی حالت میں ہے۔ جسامت اور وسعت کے لحاظ سے اٹالہ مسجد لال اور جامع مسجدوں کے بین بین ہے۔ حالاں کہ اٹالہ مسجد کی تعمیر خواجہ کامل خاں نے ۱۳۷۷ء میں شروع کرائی تھی مگر ابراہیم شاہ شرقی کے دورِ حکومت میں (۱۴۰۸ء) میں مکمل ہو سکی۔

اٹالہ مسجد کی وضع تقریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ دلّی اور اجمیر کی مسجدوں کی لیکن اس کی طرز زیبائش علائی دروازے کی حسن کاری کے بعد کی ہے۔ اٹالہ مسجد کی سب سے پرشکوہ چیز مصری معبدوں جیسی محرابیں ہیں جو بے حد پُرکار ہیں۔ یہ تین طرف سے دو منزلہ خانقاہوں سے گھری ہوئی چوگوشہ عمارت ہے جبکہ اصل مسجد مغربی سمت میں ہے۔

مسجد کی خاص عمارت پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ وسطی حصہ پر گنبد ہے کونے کے کمرے باقی عمارت سے الگ ہیں اور ان کا راستہ الگ سے ہے غالباً یہ حجرے شہزادیوں اور شاہی حرم کی دوسری خواتین کی عبادت کے لیے مخصوص ہوں گے مسجد کے اندر زنانہ حصہ شرقی طرز تعمیر کی انفرادی خصوصیت ہے۔ مسجد کا گنبد مصری طرز کی محراب سے نیچا ہے۔ لیکن محراب کے باوجود مسجد کا پورا منظر سامنے سے صاف نظر آتا ہے کیونکہ اس محراب میں کھلے ہوئے طاقچے بنے ہیں۔ صحن کے اتر دکھن دونوں جانب وسط میں مسجد کی مرکزی عمارت جیسے پھاٹک ہیں اور ہر ایک کے سامنے اونچی محرابیں ہیں جن کے پیچھے گنبد ہیں۔ ان شاندار گنبدوں کی اندرونی زیبائش کے لیے سنگ موسیٰ کا استعمال کیا گیا ہے۔

مسجد خالص مخلص

تاریخی اعتبار سے دوسرا نمبر خالص مخلص مسجد کا آتا ہے جس کو ملک خالص اور ملک مخلص نے سلطان ابراہیم شرقی کے زمانہ میں تعمیر کرایا تھا یہ دونوں شرقی سلطان کے گورنر تھے جو سید عثمان شیرازی کی مدد کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ سید عثمان شیرازی کو دلّی سے امیر تیمور نے بھگا دیا تھا مسجد خالص مخلص گومتی کے کنارے محلہ دریبہ میں واقع ہے۔ یہ بغلی عمارتوں کے ساتھ ایک وسیع اور عریض کمرے پر مشتمل ہے۔ گنبد کے سامنے چھوٹے چھوٹے کنگوروں کی منڈیر ہے جو جونپوری طرز تعمیر کے لیے بالکل انوکھی چیز ہے۔ اس مسجد کی سادگی کو برقرار رکھنے کی غرض سے زیبائش اور سجاوٹ سے احتراز کیا گیا ہے۔ خالص مخلص مسجد کو "چار انگلی" مسجد بھی کہتے ہیں کیونکہ مسجد کے خاص دروازے پر ایک عجیب و غریب پتھر جڑا ہوا ہے

خواہ انگلیاں کتنی ہی پتلی یا موٹی کیوں نہ ہوں یہ پتھر چار انگلیوں کے برابر ناپ میں ہوتا ہے۔ اس پتھر کو بھی ہندو مسلمان متبرک مانتے ہیں۔

جھنجھری مسجد

یہ مسجد بھی گومتی کے کنارے سپاہ محلہ میں واقع ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسجد کے صدر دروازے میں متعدد کھلے ہوئے طاق، جالیوں اور جھنجھریاں بنی ہوئی ہیں۔ جنرل کننگھم (CUNNNGHAM) نے غلطی سے اس کو "زنجیری مسجد" کہا ہے۔ شاید مسجد کی زنجیرے دار زیبائش اس غلط فہمی کی وجہ ہو۔ اس مسجد کو خود سلطان ابراہیم شاہ نے بنوایا تھا۔ امتداد زمانہ نے مصری طرز کی محرابوں کے علاوہ اس مسجد کی کوئی اور چیز باقی نہیں چھوڑی۔ جھنجھری مسجد دوسری مسجدوں سے یقیناً چھوٹی رہی ہوگی مگر صدر دروازے کی حسن کاری، آرائش اور سجاوٹ دوسری مسجدوں کی محرابوں پر حاوی ہے۔ پھر بھی جھنجھری اور اٹالہ مسجدوں کی یکساں زیبائش اور سجاوٹ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں کا خالق ایک ہی تھا۔

لال دروازہ مسجد

محمود شاہ کے زمانۂ حکومت (۱۴۴۰ء تا ۱۴۵۶ء) کی نشانی صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے بی بی راجی کی مسجد جس کو عرف عام میں لال دروازہ مسجد کہتے ہیں اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسجد کے پھاٹک پر سیندور کی رنگ آمیزی ہے یہ مسجد در اصل محمود شاہ کی ملکہ "بی بی راجی کے محل کی خانہ مسجد" تھی۔ اس محل کے کھنڈر اب بھی کچھ فاصلہ پر شمال مغرب میں پائے جاتے ہیں۔ اس مسجد کے علاوہ سلطان سکندر شاہ لودی نے بقیہ محل کو تہس نہس کر دیا۔

بی بی راجی کی مسجد دوسری جونپوری مسجدوں کے مقابلے میں چھوٹی ہے اس کی وضع قطع

اٹالہ مسجد اور جامع مسجد کی طرح ہے لیکن قدرے پتلی اور نازک دیواروں کی وجہ سے نسوانیت سی جھلکتی ہے۔ گنبد والے وسطی ہال کے سامنے ایک اور ہال بطور راہ داری بنا ہے جس کی مثال کسی اور شرقی مسجد میں نہیں ملتی۔ گنبد، پردہ شکدہ راہ داری اور تینوں محرابوں کے علاوہ لال دروازہ مسجد کی ایک ایک اینٹ سے ہندو طرز اور صناعی عیاں ہے۔ اس مسجد کی "زنانہ گیلری" وسطی ہال میں واقع ہے جو جونپوری طرز تعمیر کے لیے بالکل نئی اور اچھوتی چیز ہے۔

جامع مسجد

جامع مسجد یا مسجد جامع الشرق، جیسا کہ اس کا پورا نام ہے، سلطان حسین شاہ شرقی کی سب سے وسیع، کشادہ اور جونپور کی آخری عمارت ہے۔ اس کی تعمیر کے بارے میں مختلف قصے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان ابراہیم کے ڈیزائن پر یہ مسجد ایک سن رسیدہ درویش حضرت خواجہ عیسیٰ کی سہولت کے پیش نظر بنائی گئی تھی۔ کیوں کہ آپ کو جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے تقریباً ایک میل مسجد خالص مخلص جانا پڑتا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ واقعہ درست ہے یا غلط، اس مسجد کے کسی بھی حصے کی تعمیر کو سلطان ابراہیم کے نام سے منسوب کرنا مطلق صحیح نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مسجد کے نقشہ میں اس کا دخل رہا ہو۔

جامع مسجد کا نقشہ اور اس کا انداز اٹالہ مسجد جیسا ہے پھر بھی کئی معنوں میں جامع مسجد کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اول تو یہ کہ جامع مسجد دوسری مساجد کے مقابلہ میں بہت زیادہ اونچی کرسی پر بنائی گئی ہے۔ جامع مسجد الگ الگ کمروں میں منقسم ہے وسطی کمرے کی چھت پر گنبد ہے جس کے دونوں طرف کھمبوں پہ ٹکے ہوئے دو کمرے ہیں۔ اس مناسبت سے وسطی ہال کو "گنبد" اور بغلی کمروں کو چھت کہا جاتا ہے کٹو (KITTOE) کے کہنے کے مطابق "گنبد والا کمرہ جونپوری صناعی کی معراج ہے۔ گنبد کی بالائی پرت اندرونی حصے سے کئی فٹ دور ہے۔ گنبد کی وضع کمرخی یعنی پھل دار ہے۔" وسطی کمرے سے ملحق کمرے

دو منزلہ ہیں جن میں جھنجھریوں اور جالیوں کا کام ہے۔ چونکہ ان کمروں کا راستہ الگ سے ہے اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمرے اس مسجد کے زنانہ حصے رہے ہوں گے۔

جونپوری طرز تعمیر کی خصوصیات

جونپوری طرز تعمیر کی تین اہم خصوصیات ہیں۔ مصری معبدوں جیسی صدر دروازوں کی محرابیں، در و دیوار کی آرائش اور زنانہ گیلریاں اور حجرے۔ لیکن جونپوری مسجدوں کو انفرادیت بخشنے والی مصری محرابیں ہی ہیں۔ ماہرین فن تعمیرات میں اس بارے میں اختلاف رائے ہے کہ مشرقی مساجد کے واحد گنبدوں کو ڈھانکنے والی محرابوں کا کیا مقصد ہے۔ اگرچہ جان مارشل نے شرقی محرابوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مسجدوں کی شان و شوکت کو دوبالا کرتی ہیں اور عبادت خانوں کو زیادہ پُر اثر بناتی ہیں۔ لیکن مسلم فن تعمیرات میں کچھ چیزیں ایسی آگئی ہیں جو اسلامی فن تعمیر سے متعلق روایات کے بالکل برعکس ہیں۔ شرقی عمارات میں ایسے غیر اسلامی خد و خال کی بہتات ہے۔ بے ساختہ طور پر اُٹھتے ہوئے قدیم مصری معبدوں جیسے چوکور اور پُرشکوہ محرابوں والے پھاٹک جو مسجد کے اصل گنبدوں کو قریب سے ڈھانکے ہوئے ہیں یکسر غیر اسلامی ہیں جب کہ کسی اور جگہ مسجدیں بنانے والوں کو روایتی اسلامی طرز تعمیر سے اس قدر منحرف ہونے کی اتنی ہمت نہیں ہوئی۔ جان مارشل نے اس جدت طرازی اور بے ڈھنگے پن کے لیے ہندو کاریگروں کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ کسی ایسے کمرے کو باہر سے دیکھا جائے جس پر پُرشکوہ گنبد کا تاج ہو مگر اس کی دیواریں گنبد کی مناسبت سے پُرشکوہ اور پُر اثر نہ ہوں تو آنکھوں کو واقعی بھلا نہ معلوم ہوگا۔ شاید اسی لیے جونپور

کے پٹھان حکمرانوں نے گنبد کی بے ڈولی اور غیر مناسب جسامت کو کم کرنے کیلئے مصری طرز کی یہ عظیم محرابیں بنوائیں۔ ان مساجد کے خالق واقعی لائق صد ستائش ہیں کہ انھوں نے اتنا اچھا، اتنا مکمل اور ناقابلِ نقل طریقہ اپنایا۔ اس طرح اگر مسلم مساجد کی شان گنبدوں کی موجودگی سے باقی رہی تو پوری عمارت میں ایک قسم کی یکسانیت اور موزونیت بھی محرابوں کی وجہ سے آگئی۔

شرقی طرز و انداز

ڈی، اے، اسمتھ کے خیال میں" جونپوری طرز تعمیر میں تغلقی عمارات کی جسامت اور سطوت بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دلی کی عمارات کی سی سادگی اور عظمت جونپوری مسجدوں میں نہیں ہے۔ وہ نسبتاً زیادہ جاذبیت اور سجاوٹ کی حامل ہیں۔ اس کی خاص وجہ ہندو اور اسلامی طرز تعمیر کی حسین آمیزش ہے جس کا نمونہ جونپوری مسجدیں ہیں"۔ شرقی مساجد تغلقی مساجد سے کہیں زیادہ آراستہ اور سجاوٹ کی حامل ہیں۔ تغلقی مسجدوں میں مصری طرز کی محرابیں نہیں ہیں۔ حالاں کہ وہ جونپوری مسجدوں کی ایک خصوصیت ہیں نیز ان کی شان و شوکت میں اضافہ کرتی ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جون پوری مساجد کا غلام گردش مندروں کا حصہ تھیں۔ جن کو خوبصورتی سے مسجدوں میں شامل کر لیا گیا جیسا کہ دلی کی مسجد قوۃ الاسلام کے ساتھ ہوا ہے۔ فرگوسن کے خیال میں جونپور کے طرز تعمیر میں ہندو مسلم امتزاج کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شرقی حکمرانوں نے اپنی تعمیرات میں ہندو معماروں سے کام لیا۔ اس کے علاوہ نو مسلم کاریگروں نے بھی جونپوری تعمیرات میں حصہ لیا اور یہ وہ لوگ تھے جو اپنے قدیم فن اور روایات کو نہیں بھولے تھے چنانچہ فرگوسن کے اس دعوے کے زندہ ثبوت ناگری رسم الخط میں لکھے ہوئے وہ کتبے ہیں جو بیشتر مسجدوں

میں ملتے ہیں۔ ان کتبوں سے ہم کو ان مسجدوں کا سنِ تعمیر اور معماروں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔

جونپوری مسجدوں کی حسن کاری اور سجاوٹ کا انداز خالص ہندوانہ ہے کنول کا پھول ہمیں متعدد جگہ ملتا ہے یہاں تک کہ مسجدوں میں قبلہ کے مقام پر بدھ طرز کی گھنٹیوں کے درمیان "اللہ" کھدا ہوا ہے۔ جونپور اب بھی صناعی اور فنِ تعمیر کے دلدادہ لوگوں کے لیے حیات آفریں جگہ ہے یہاں کی تمام یادگار عمارتیں دریائے گومتی کے کنارے کنارے ریلوے لائن کے پشتے سے یکے بعد دیگرے نظر آجاتی ہیں اور اپنی زبان خاموش سے گزشتہ شان و شوکت اور گرم و سرد زمانہ کی سیکڑوں کہانیاں کہہ ڈالتی ہیں۔ ٹرین سے جونپور کی بھولی بسری شان و شوکت کی ان عظیم نشانیوں کو دیکھتے ہوئے یکبارگی یہی خیال دل میں آتا ہے کہ کاش ٹرین کچھ دیر کے لیے رُک جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ٹرین آگے بڑھتی جاتی ہے اور یہ عمارتیں دور ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ شام کے دھندلکے اور شفق کے پس منظر میں یہ عمارتیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے کسی مصور نے اپنا شاہکار بناتے بناتے بے خیالی کے عالم میں پنسل سے متعدد جگہ گہرے نشانات بنا دیے ہوں۔

ـــــــــــــــــــــ

مالہ بنجارہ

شیر شاہ اکبر اور درمیانی کڑی۔ اسلام شاہ

مورخین نے شیر شاہ کے فرزند اور جانشین اسلام شاہ کو نظر انداز کر دیا ہے یا یوں کہیے اس سے صرف نظر کر لیا ہے اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں اگر اس کا تذکرہ ہے بھی تو بہت ہی سرسری۔ نرود بھوشن رائے نے اپنی تالیف "شیر شاہ کے جانشین" (زبان انگریزی) میں اسلام شاہ کے دور حکومت پر نظر ڈالتے ہوئے آخر میں اس کو شاندار خراج تحسین ادا کیا ہے۔

تاریخ میں اسلام شاہ کا دور حکومت ایک خاص درجہ رکھتا ہے، وہ ہندی قرون وسطی کے حکمرانوں کے مقابلہ میں ایک الگ مقام پر فائز نظر آتا ہے ہم سردست اس کے کردار کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ابوالفضل جو سور خاندان کا کٹر دشمن تھا اس کی رائے ہے کہ "چند ہی حکمران فوجی صلاحیت، حکمت عملی، عدل اور اچھی حکمرانی میں ان دونوں یعنی شیر شاہ اور اسلام شاہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں" ارسکن (E R S K I N E) کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے (یعنی اسلام شاہ کے) کردار کا جو نقشہ مورخین نے پیش کیا ہے وہ وہ نہیں ہے

جس کی توقع اس کے عہد کے عوامی معاملات کی بنا پر کیجا سکتی ہے۔" یہ دونوں رائیں اتنی وقیع ہیں کہ ان کی بنا پر یہ تسلیم کئے بنا چارہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام شاہ ایک بلند شخصیت کا مالک تھا۔ سنبھل میں اس نے نیازی عورتوں کی بے عزتی کی اور ان پر مظالم کیے یقیناً یہ افعال اس کے صاف چہرہ پر بدنما دھبے ہیں لیکن اتنی بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ دھبے اس عہد کی خصوصیات میں سے ہیں۔

قرون وسطیٰ کے ہر حکمران کا دامن بلا کسی استثنیٰ کے ایسے دھبوں سے داغدار ہے جوش انتقام میں اچھے سے اچھے حکمراں بھی کبھی اس قسم کے وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

دہلی سلطنت :-

تاریخ ہند میں اسلام شاہ کا اصل مقام متعین کرنے کے لیے شیر شاہ کی تخت نشینی سے پہلے کے سلاطین دہلی کا ایک مختصر جائزہ لے لینا اولین شرط ہے۔ مسلمان ۱۲ؐ ہ ۶ میں ہندوستان آئے اور تیرھویں صدی عیسوی میں اس ملک میں ان کی جڑیں مستحکم اور مضبوط ہو گئیں۔ ملکی آبادی نے جن کی اکثریت ہندو تھی سیاسی اور تباہی و بربادی کے خوف سے ان کی اطاعت قبول کی۔

مسلمانوں نے حکومت کے مفاد میں اپنے شخصی اور قومی مفاد کو کبھی بھی ضم نہیں کیا اور نہ ہندو رعایا ہی نے اپنے مخصوص نظریہ شاہی کے مطابق مسلمانوں کو اپنا حاکم اور فرماں روا تسلیم کیا۔ یہ ایک پر خطر سودا تھا۔ ہندو مجبوراً منھ مانگا خراج دے کر اور اطاعت قبول کر کے اپنی زندگی، زندگی کی خوشیاں اور ضمیر کی آزادی خریدتے تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے دروازے ان پر بند تھے۔ شیر شاہ پہلا مسلمان

حکمراں تھا جس نے عوام کی مرضی کے مطابق اور ان کے مفاد میں ملک پر حکومت کرنے کا ایک عمدہ نقشہ تیار کیا اور حکومت کی بنیاد عوام کی خیر خواہی پر رکھی اس نے یہ محسوس کیا کہ ملکی آبادی کے تمام گروہوں کی وفاداری صرف بے لاگ عدل اور غیر جانبدارانہ حکومت ہی کے ذریعہ جو فرقہ وارانہ اور مذہبی امتیازات سے بالاتر ہو حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی تمام فطری صلاحیتوں کے بروئے کار لانے اور سلطنت کی خدمت کرنے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے اس انوکھے تجربہ کا جرأت کے ساتھ آغاز کیا جو تقریباً ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے بالکل نیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تجربہ کے سلسلہ میں سب ابتدائی کام اس نے خود انجام دیئے، زمین ہموار کی اور سلطنت کے معاملات کو صحیح خطوط پر ڈال دیا۔ مختلف اداروں کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا دور حکومت اہم ہے ـــــ ان اداروں کا آغاز اور ارتقاء ـــــ مثال کے طور پر چند اداروں کا نام گنا دینا ہی کافی ہوگا۔ جیسے مالگزاری، سکہ، تجارت، سڑکیں، سرائیں، پولس اور عدل ـــــ یہ ادارے اب بھی اس کے نام کی یاد دلاتے ہیں وہ اس نقطۂ نظر سے بھی ہماری تحسین و آفریں کا مستحق ہے کہ اس نے فوجی تنظیم میں بھی اہم تبدیلیاں کیں اور نیچے سے اوپر تک سلطنت کے پورے ڈھانچہ کی از سر نو تنظیم کی۔

عام طور پر مورخین شیر شاہ کے نظریات اور اس کی کامیابی کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے بلا توقف سیدھے اکبر تک پہونچ جاتے ہیں۔ شیر شاہ کو اکبر کا پیشرو ـــــ یعنی ایک ایسا حکمراں جس نے کچھ سعی کی لیکن جس کے نظریات کی تکمیل دوسرے حکمراں کے دور میں ہوئی ـــــ قرار دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا خلا ہے۔ ان دونوں حکمرانوں کے مابین ایک بڑا فاصلہ ہے ایک سیدھی سڑک چلی گئی ہے اور دونوں سروں کے بیچ

میں ایک پُل ہے۔ دنیا کی ان دو درخشاں شخصیتوں کے درمیان جن میں سے ایک نے کچھ نئے نظریات کو جنم دیا اور دوسرے نے ان نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ ایک اور شخصیت بھی ہے ان دو عظیم الشان آفتابوں کی چمک دمک نے اس ماہتاب کی نرم نرم اور خنک چاندنی کو گہنا دیا ہے۔ یہ ماہتابی شخصیت اسلام شاہ ہے جو شیر شاہ اور اکبر کی درمیانی کڑی ہے شیر شاہ کی وفات اور اکبر کی تخت نشینی کے درمیان ایک بڑا فاصلہ ہے جسے عبوری دور کہنا چاہئے۔ یہ عبوری دور ساڑھے گیارہ سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے اور جس کے دو تہائی حصوں پر اسلام شاہ کا دور حکومت حاوی ہے۔ اسلام شاہ کی وفات کے بعد کی خانہ جنگی اور تخت ہند پر مغلوں کی دوبارہ واپسی شیر شاہ کے آغاز کردہ اور اسلام شاہ کے ترقی دادہ کاموں کو نہ بدل ہی سکی اور نہ ان میں خلل ہی ڈال سکی۔ خانہ جنگی میں مختلف دعوے دار ان سلطنت ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہمایوں کے پاس نہ وقت ہی تھا اور نہ اس کا رجحان اس طرف تھا کہ وہ اس سمت میں کوئی ٹھوس کام کر سکتا۔ اسلام شاہ کا جہانگیر یا شاہجہاں سے موازنہ کرنا درست نہ ہوگا۔ ان حکمرانوں کو ترکہ میں ایک مستحکم حکومت، بھرپور خزانہ اور ایک منظم فوج ملی تھی اور وہ زیادہ تر اپنے عظیم اسلاف ہی کے نقش قدم پر چلتے رہے تھے کے برعکس اسلام شاہ کو حکمرانی کا ایک دھندلا نظریہ، محض ایک خاکہ ہی ورثہ میں ملا تھا۔ اگر اس نے اپنے باپ کی حکمت عملی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہوتا تو بھی اسے مورد الزام نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر اس نے اورنگ کی طرح رجعت اختیار کر لی ہوتی تو بھی اس کے سر کوئی جرم عائد کرنا آسان نہ ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ اسی پرانی پالیسی کی طرف لوٹا ہوتا جو ایک طرح سے فطری بن چکی تھی اور حکومت کا وہ نظام جس کا انحصار فوجی قوت پر ہو۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ قرون وسطیٰ کی ایک اہم

خصوصیت تھی۔

مقدس امانت:۔

شیر شاہ سور خاندان کا ہیرو اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی احیاء کا ستارہ سحری تھا۔ شیر شاہ نے اپنے فرزند اسلام شاہ کو انسانیت نواز فلاحی اداروں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تخلیق کا ایک صحت مند منصوبہ، عدل پر مبنی نظام حکمرانی اور ہر دلعزیز حکومت کے لیے تیار زمین کی ایک مقدس امانت سپرد کی تاکہ وہ "عصر کے فرزند جلیل" اکبر اعظم کو یہ مقدس ورثہ سونپ سکے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس نے اپنے فرائض اچھی طرح انجام دیئے اور اس کی سب بڑی دین سابقہ حکومت کی قومی روایات کی حفاظت ہے اسلام شاہ نے اپنے باپ کے تمام فلاحی اداروں کو بجنسہٖ قائم رکھا۔ اس کے حکم سے اس کے باپ کی تیار کردہ ہر دو سراؤں کے درمیان ایک نئی سرائے تعمیر کی گئی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شیر شاہ اور اسلام شاہ کے دور میں ہندوؤں کی حالت جتنی اچھی تھی اس سے پہلے کبھی بھی نہیں تھی۔ ایک ایمان دار امین کی طرح اس نے کانٹوں کو صاف کیا اور امانت کی بے قاعدگیوں اور خامیوں کو دور کیا، اس کو زیادہ پاک وصاف اور درخشاں بنایا۔ اور جب اس امانت کے وارث نے حکومت کا نظم ونسق سنبھالا تو اسلام شاہ ہی کی وجہ سے وہ امانت اس کے ہاتھوں میں پہونچ گئی۔ لودیوں کے دور میں ہندو اور مسلم دونوں نقاطِ نظر سے ادارہ شاہی اپنے بلند نصب العین سے گر چکا تھا۔

شیر شاہ اگرچہ اقتدار اعلیٰ کا دلدادہ تھا پھر بھی وہ سلطنت کے اہم معاملات اور پالیسی میں افغان امراء سے مشورہ کرتا تھا لیکن یہ اسلام شاہ ہی تھا جس نے صرف احیاء ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ "ادارہ شاہی" کی واضح تشریح کی جس کی تکمیل اکبر کے

ہاتھوں ہوئی، اگر اسلام شاہ نے ہر دلعزیز فلاحی اداروں اور متحدہ قومیت کے حامل نظریات کو قائم نہ رکھا ہوتا یا ان پر خط تنسیخ پھیر دیا ہوتا تو اکبر کے لیے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتا کہ وہ اتنی تیزی کے ساتھ شیر شاہ کے خواب کی تعبیر کی طرف قدم بڑھا سکے اور جو زمین تیار ہو چکی تھی اس میں نئے نظریات اور اپنے پسندیدہ منصوبوں کی تخم ریزی کر سکے۔

اس لیے ہم معقول طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اکبر اعظم کی عظمت ایک طرح سے اسلام شاہ کی مرہون منت ہے۔

قطب مینار کا فنی ماخذ اور اس کا بانی

قطب مینار کے فنی ماخذ اور اس کے بانی کی تحقیق کے بارہ میں انیسویں صدی عیسوی کے آخری پورے ربع میں، گرما گرم بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ کوپر (COOPER) اور سلی مین (SLEEMAN) جیسے اہل علم حضرات نے اس بلند مینار کے بارہ میں مفروضہ ہندو فنی ماخذ کی تائید کی۔ اس رائے کو زبردست تقویت اس وقت ملی، جب سر سید احمد خاں نے جو ایک باخبر مستشرق تھے، دنیا کے سامنے اپنی یہ رائے پیش کی کہ یہ شاندار عمارت رائے پتھورا یا پرتھوی راج کی تخلیق ہے۔ سر سید نے ایک سچے مورخ کا پارٹ ادا کیا۔ ان کی یہ رائے ان کی وسیع القلبی اور ان کے غیر جانبدارانہ نقطہ نظر پر دلالت کرتی ہے۔ میجر جنرل اے کننگھم (MAJOR GENERAL A. CUNNINGHAM) اور والٹر ایور WALTER EWER نے اس مینار کے ہندو ماخذ کی تائید میں سر سید کے دلائل کو پورے طور پر رد کیا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ سر سید نے ان حضرات کی تردید سے پہلے ہی آثار الصنادید

Archaeological Survey of India vol IV Preface

Asiatic Researches, vol XIV Calcutta 1822

کی دوسری اشاعت میں (نول کشور پریس ۱۸۹۵ء) اپنی رائے بدل دی تھی۔ آثار الصنادید دوسری بار ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئی تھی۔ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ سرسید کی اب رائے یہ تھی کہ قطب مینار التمش کی تعمیر کردہ مسجد قوت الاسلام کا ایک مینار ہے۔ [1]

دوسرا اختلاف :-

موجودہ صدی کے طلوع کے ساتھ اس بحث کا خاتمہ ہوگیا اور یہ مسئلہ متنازعہ نہیں رہا کہ قطب مینار مسلمانوں کا کارنامہ ہے لیکن قطب مینار سے ہی متعلق دوسرا مسئلہ اختلافی بنا رہا وہ یہ کہ اس مینار کا بانی کون ہے۔ قطب الدین ایبک یا اس کا دست پروردہ اور جانشین سلطان التمش؟ سرکاری نقطۂ نظر نے دونوں میں مصالحت کرادی اور یہ رائے ظاہر کی کہ مینار کا آغاز قطب الدین ایبک نے کیا تھا اور التمش نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا لیکن اب بھی کچھ مورخین ہیں جو اس رائے کی تائید میں کہ قطب مینار ہندو کارنامہ ہے نظریات پیش کرتے رہتے ہیں۔

عمارت اور فنی شعور :-

بودھوں کو ہم عظیم مینار سازوں کی حیثیت سے جانتے ہیں جنھوں نے کبھی بودھوں کی زبان میں "جے استمبھ" یا منارہ فتح، اپنے کارناموں کی یادگار کے طور پر تعمیر کئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قطب مینار عمارتوں (MONOMENTS) کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس میں ہندوؤں کو خصوصی برتری حاصل تھی لیکن ہیول (MAVELL) بھی، جو فنون اور فن تعمیر میں ہندو۔ بودھی روایات کا زبردست اور کٹر مداح ہے۔ قطب مینار کے بارہ میں صرف اس حد تک جاننے کی جرأت کرتا ہے کہ ہندی طرز میں عرب ترمیم جس

---

[1] آثار الصنادید دوسرا ایڈیشن صفحہ ۵۷

کی بہترین مثالیں چتوڑ کے دو دو مینار ہیں جو آج بھی موجود ہیں" تاہم وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ قطب مینار موذنہ تھا اور پاس کی مسجد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن ہندو یا بودھی روایات کے تنگ دائرہ سے نکل کر صداقت کا کھوج لگانا بہرحال ضروری ہے۔

ہر مسجد کے لیے میناروں کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ متصل ہوں یا منفصل، جہاں سے موذن مسلمانوں کو نماز کے لیے پکار سکے۔ وی۔اے اسمتھ (ہسٹری آف فائن آرٹس ان۔انڈیا اینڈ سیلون) قطب مینار کو مسجد قوت الاسلام کا ایک منفصل مینار قرار دیتے ہیں۔ جس کو زمانہ مابعد میں مینارۂ فتح کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا جو سرزمین کفر میں اسلام کے ایک نئی قوت اور ایک بالقوۃ عنصر کی حامل زبردست طاقت ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

مینار" جیسا کہ سر جارج برڈ ووڈ (SIR GEORGE BIRDWOOD) کہتے ہیں "فن تعمیر میں عربوں کی ایک تخلیقی دین ہے"[۱] قطب مینار پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر سریندر ناتھ سین (Surender Nath Sen) کہتے ہیں "طرز اور کردار میں یہ مینار اتنا واضح طور پر اسلامی ہے کہ ہم بلاخوف تردید اس کے راجپوتی تعمیر ہونے کی کہانی کو بے بنیاد قرار دے سکتے ہیں"[۲]

بنیادی طور پر اسلامی:۔

اس لیے ہمارے پاس فرگسن (FERGUSSON) اور جان مارشل (John Marshal) کی اس رائے کو کہ قطب مینار، دنیا میں کہیں بھی پائے

---

[۱] Journal of Royal Society of Arts January 1911 Page 179
[۲] Delhi and its monuments Page 4-

جانے والے مینار کی مکمل ترین مثال ہے" تسلیم کرنے کے وجوہ موجود ہیں۔ اس مینار کی تخیل اور تقریباً اس کی جملہ تفصیلات اور آرائش بنیادی طور پر اسلامی ہے۔ اس قسم کے مینار ہندوستانیوں کے لیے بالکل اجنبی تھے لیکن جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس قسم کے میناروں سے، خواہ وہ بہ حیثیت موذنہ مسجد سے متصل ہوں یا غزنی کے میناروں کی طرح آزاد اور غیر متصل، عرصہ سے مانوس تھے۔ آج صرف دو قابل ذکر قدیم یادگاری عمارتیں غزنی میں موجود ہیں ــــ ایک محمود غزنوی کا مقبرہ اور دوسرے دو چھوٹے چھوٹے فتح مینار۔ جن میں سے مقبرہ کی تعمیر محمود نے خود کرائی تھی اور فتح میناروں کی تعمیر محمود کے جانشین مسعود کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ مینار ہمارے لیے قطب مینار کے اولین نمونے اور ان میناروں کے مثل ہونے کی حیثیت سے جو ایران میں دامغان اور مجدہ کے مقام پر اور میسوپوٹامیہ میں طوق؛ TAUQ میں پائے جاتے ہیں، خصوصی طور پر دلچسپی کا باعث ہیں۔ چتوڑ اور مانڈو کے مینار جو بعد کی تعمیر ہیں، خاکہ اور خصوصی خدوخال میں قطب مینار کی بھدی نقلیں ہیں۔ جہاں تک کہ قطب مینار کا تعلق ہے اس کے طغرائی کتبے، اور اس کے چھجوں کے نیچے سہارا دینے کے لیے بھرپور چونہ کاری، ــــ جن کے خصوصی خدوخال کا ابتدائی سراغ مصر اور مغربی ایشیا کے فن تعمیر میں اور جس کو تقدم زمانی حاصل ہے، لگایا جا سکتا ہے ــــ اسلامی فن تعمیر کے امتیازی علامات ہیں اور یہ امتیازی علامات قطب مینار کی بیرونی سطح پر پیوند کاری نہیں معلوم ہوتے اس لیے انھیں بعد کا خیال نہیں کہہ سکتے ہیں۔

تعمیر کے مقاصد:-

بقول کننگھم اس بلند مینار کی تعمیر کے دو مقصد تھے۔ پہلے مسلم فاتح نہایت ہی جاندار لوگ تھے۔ ان کی تخیل اور ان کے تصورات بھی اتنے ہی جرأت مندانہ اور حوصلہ مندانہ تھے

جتنے کہ ان کے اعمال ---- جب ان پرجوش مسلمانوں نے، شاہی توموں اور مغرور چوہانوں کے دار السلطنت شہر دہلی پر نظر ڈالی تو ان کی اوّلین خواہش یہی ہوئی ہو گی کہ وہ کافروں کے غرور کو خاک میں ملادیں۔ اور دوسری خواہش ان کی یہ ہوئی ہو گی کہ وہ بنی جلال پیغمبر اسلام کے نام کو سربلند کر دیں۔ ان ہر دو مقاصد کے حصول کے لیے مسلمانوں نے اس بلند مینار کی تعمیر کی جس کی بلند چوٹی سے موذن کی آواز کو ہر طرف سے ہندو اور مسلمان دونوں سن سکیں۔ یہ نفیس عمارت، شہر کے بلند ترین مکان سے بھی نہایت ہی پرشکوہ انداز سے بلند تر تھی۔ کچھ مورخین یہ شبہہ ظاہر کرتے ہیں کہ آیا یہ مینار موذنہ کا کام دے بھی سکتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت کہ فی الواقع یہ مینار بطور موذنہ استعمال ہوتا شمس سراج عفیف کے ۱۳۸۰ء کے بیان سے جھلکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شاندار مینار دہلی کہنہ کی مسجد میں سلطان شمس الدین التمش نے بنوایا تھا۔ لیکن ابوالفدا کے بیان سے جو تقریباً ۱۳۰۰ء کی تحریر ہے، یہ حقیقت ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ وہ دہلی کی جامع مسجد کے موذنہ کا مفصل ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

یہ موذنہ سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور بہت بلند ہے اس میں بہت سے پہلو اور ۳۶۰ زینے ہیں۔ یہ بیان موجودہ قطب مینار ہی پر منطبق ہوتا ہے۔ جس میں موجودہ صورت میں ۳۷۹ زینے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں اس مینار پر بجلی گری تھی۔ اس متشرع سلطان نے مینار کی دو بالائی منزلیں ۱۳۶۸ء میں تعمیر کرائیں اور غالباً مزید انیس (۱۹) زینوں کا اضافہ اسی نے کرایا۔ اسی

حقیقت سے اس فرق پر بھی روشنی پڑتی ہے جو پہلی تین نچلی منزلوں اور دو بالائی منزلوں کی نقاشی میں نظر آتا ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ قطب مینار کی تین زیریں منزلیں ہندو فن کاری کا نتیجہ ہیں اور صرف مابقی دو بالائی منزلیں مسلم فن کاری کی مرہون منت ہیں، واضح تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے

ناگری کتبے:۔

قطب مینار پر ناگری کتبوں کی موجودگی نے بہت شکوک پیدا کر دیئے ہیں اس نظریہ کی تائید میں کہ قطب مینار ہندو تخلیق ہے، مسٹر بگلر (CEGLAR) نے آرکیولوجیکل سروے رپورٹ (جلد چہارم) میں تین ناگری کتبوں کی نشان دہی کی ہے:

(۱) دروازہ (ENTRANC) کے داہنی جانب باہر کرسی پر "سمت ۱۲۵۶" کندہ ہے۔ ۲۔ اندرونی دروازہ کے راستہ کی دیوار پر جانب چپ "سمت ۱۲۵۶" کندہ ہے (۳) زیریں ترین سنگ قوس (LIARCHSTNE) کے نیچے "سمت ۱۲۵۶" کندہ ہے۔

مسٹر بگلر (BEGLAR) نے دلائل پیش کیے کہ یہ عمارت یقیناً مسلم فتوحات سے بہت پہلے تعمیر ہوئی ہوگی۔ میجر جنرل کننگھم کو بھی یہ تینوں کتبے دکھائے گئے انھوں نے مسٹر بگلر اپنے معاون سے کہا کہ وہ سمت ۱۲۵۶ سے پہلے گم شدہ ہندسہ لگادیں اور یہاں نو آمدہ زمانے سے عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ گم شدہ ہندسہ صرف "۱" ہوسکتا ہے اس طرح تاریخ "سمت ۱۲۵۶" بنتی ہے۔ سنہ عیسوی میں بدلنے کے بعد تاریخ ۱۱۹۹ ہوگی جو قطب مینار کا سال اتمام ہے غالباً پہلی منزل کی یا زیادہ سے زیادہ دوسری منزل کی)۔

کچھ دیگر حضرات قطب مینار پر لفظ "پرتھی" کی نشاندہی کرتے ہیں جو ان کے نزدیک بات کا اشارہ ہی نہیں بلکہ اثباتی ثبوت ہے کہ یہ پرشوکت مینار پرتھوی راج نے

بنوایا تھا لیکن اگر یہ کتبہ "پرتھی" قدیم ہوتا تو کنگھم، بگلر، والٹر اور ای تھومس E. THOMAS اور سر سید احمد خاں جیسے ماہرین کی نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ان ماہرین آثار قدیمہ کی تحریروں میں اس لفظ "پرتھی" کا کہیں بھی ذکر نہیں یہ ایک پر فریب چال ہے جو قریب ترین زمانہ میں چلی گئی ہے تاکہ "چیزوں کی موجودہ ترتیب میں شک" پیدا کیا جا سکے اور اسے درہم برہم کر دیا جائے۔ ایک اور بات اس سلسلہ میں قابل غور ہے۔ ہندو مندروں اور عمارتوں کا ملبہ آزادی سے مسلم تعمیرات میں استعمال کیا گیا۔ اس لیے ایسے سنگ پارے جن پر کوئی کتبہ ہو خالص مسلم تعمیرات میں بھی آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ایسے کتبوں کو کسی تعمیر کے بانی یا اس کے فنی ماخذ کے تعین میں شہادت قطعی کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اسے دیگر متعلقہ حقائق کے ساتھ تولنا اور اس کی جانچ کرنا ضروری ہوگا۔

مسلم عبقریت (MUSLIM IAEKINS

مسٹر بگلر (BEGLAA) کا کہنا ہے کہ قطب مینار پر جو خوبصورت کتبے ہیں ان کی دھاریوں (BANDOS) کے درمیانی فاصلوں میں جو اقلیدسی بڑھاؤ ہے (geometrical Progress) وہ کبھی بھی غیر مہذب مسلم فاتحین کا کارنامہ نہیں بلکہ ذہین اور مہذب ہندوؤں کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے" یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب، اسپین، ایران اور وسط ایشیا میں مسٹر بگلر کی مسلم تاریخ سے کلیتہً بے خبری کو ظاہر کرتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے جب کہ مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر اپنی طاقت مستحکم کر چکے تھے، مسلمان تہذیب کی اس بلندی تک پہونچ چکے تھے کہ جان (JOHN MARSHAL) کے لفظوں میں

یہ سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ فن تعمیر میں اپنی نئی رعایا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کریں وہ خود اپنے ایک نہایت ترقی یافتہ فن تعمیر کے مالک تھے اور ان کا فن تعمیر اتنا متنوع اور اتنا شاندار تھا جتنا کہ ہم عصر عیسائی یورپ کا ۔ مزید براں وہ مسلمان جنھوں نے ہندوستان فتح کیا تھا ۔ افغانی ، ایرانی اور ترکی النسل مسلمان ۔ وہ فن تعمیر کے لطیف ، خداداد اور فطری ذوق سے بہرہ ور تھے ۔ وہ تصویر ۔ جس میں کچھ مورخین نے ان مسلمانوں کو ایک نیم وحشی کوہستانی کی صورت میں ایک قدیم برتر تہذیب پر حملہ آور دکھایا ہے صداقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ۔"

جب مسلمانوں نے شمالی ہند فتح کیا اور مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار کی تعمیر کی ، اس وقت تک وہ قبل از اسلام عرب کی خانہ بدوشی اور ترکستان کے دور وحشت سے بہت اوپر اٹھ چکے تھے ۔ مسلمانوں نے خود ایک ایسی تہذیب کی تخلیق کی تھی جو ہمعصر دنیا کی تہذیب سے بالاتر تھی وہ تخئیل اور ذہانت سے عاری نہ تھے تخئیل اور ذہانت کو یونانیوں یا ہندوؤں کی اجارہ داری نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ فن آرائش میں اگر مسلمانوں نے کسی چیز کو ترقی دی تھی تو وہ یقیناً اقلیدسی نقاشی Geometrical Design تھی ۔ جس کے وہ تقریباً شیدائی تھے ۔ محلات و مساجد کی تزئین کے لیے ، خواہ کسی باغ کی منصوبہ کاری ہو ، یا پتھر کی جالیوں کا بنانا ہو وہ ہر جگہ اقلیدسی نقاشی سے کام لیتے تھے ۔

کتبے :-

قطب مینار کی تاریخ اس کے کتبوں میں تحریر ہے مسٹر والٹر ایور (WALTER EWER) نے ان کے پڑھنے میں سخت محنت کی ۔ ان کی محنت کا پھل ایشیاٹک ریسرچز (Asiatic Researches) میں ان کے ایک مقالہ کی صورت میں محفوظ ہے ۔[1]

---

[1] An Account of the Inscription on Cootub Minar VOL. XIV Calcutta 1822, P.P. 480-890

اسی طرح کی دوسری کوشش ای ٹھوس (E. Thomas) نے سرسید احمد خاں کی ہمراہی میں کی۔[1] ان تمام کتبوں کا ایک حالیہ ماہرانہ جائزہ، غلام یزدانی کی مرتبہ Epigraphia indo Muslimica ۱۲-۱۹۱۱ء میں لیا گیا ہے ان تحریروں کا مطالعہ ان کتبوں کے مستند اور اصلی ہونے کے سلسلہ میں کسی شک و شبہ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتا۔ ان سے واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دہلی کے کئی مسلمانوں نے قطب مینار کی تعمیر اور مرمت میں حصہ لیا ہے۔

قطب مینار کی تعمیر کس نے کی؟

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس عظیم اور نفیس مینار کی تعمیر کا سہرا مسلم سلاطین میں سے کس کے سر ہے۔ اس سلسلہ میں بظاہر اصل مقابلہ قطب الدین ایبک اور اس کے جانشین اور داماد التمش میں معلوم ہوتا ہے۔ قطب مینار کی بنیادی منزل (Basement floor) کی پہلی اور سب سے نچلی پٹی میں ایک کتبہ ہے الامیر الاسفہسالار الاجلال الکبیر (امیر۔ فوج کے سپہ سالار۔ پر شوکت۔ اعظم) یہ کتبہ قطب الدین ایبک کی طرف راجع ہے اور مسٹر تھومس اسے اس بات کا ایک مزید تحریری ثبوت قرار دیتے ہیں کہ قطب الدین ایبک نے قطب مینار کی تعمیر میں عملی حصہ لیا تھا۔ اسکے برعکس مسٹر آر۔ این منشی (R. N. Munshi)[2] اس بات کے مدعی ہیں کہ شمس الدین التمش قطب مینار کا اصل بانی تھا۔

---

[1] Thomas chronicles of the Pathan kings of delhi

[2] The history of the Kutab Minar

وہ مذکورہ بالا کتبہ کی تنقید کرتے ہیں اور اس کے عالم وجود میں آنے کی ایک مختلف توجیہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ التمش کے کردار کا Inception) آغاز ہی (جبکہ اسے غلام کی حیثیت سے قطب الدین ایبک نے خریدا) تمام تر قطب الدین کا مرہون منت ہے۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ یہ التمش کا گہرا جذبہ احسان مندی و شکر گزاری تھا جس نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مینار پر اپنے آقا اور خسر کا نام ـــــ وہ نام جو اس کے لیے قدرتاً عزیز ہونا چاہئیے تھا ـــ کندہ کرادے۔ اور وہ اور بھی وجوہ پیش کرتے ہیں اور شمس سراج، ابو الفدا، سلطان فیروز شاہ تغلق اور سلطان سکندر لودی کے بیانات پر ـــ جو قطب مینار کو سلطان التمش سے منسوب کرتے ہیں ـــ اعتماد کرتے ہیں۔ ایک کتبہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مینار کی تعمیر کا فرمان شمس الدین التمش نے دیا تھا۔ لیکن اس کتبہ کی تردید ایک اور کتبہ سے ہوتی ہے جو یوں ہے۔ "اس کی تعمیر کی تکمیل کا فرمان بادشاہ موید من السماء، آفتاب صداقت و دین التمش نے دیا تھا"

دو اور کتبے:-

اس کتبہ کے علاوہ، جس میں قطب الدین ایبک کے القاب دیے گئے ہیں دو اور بھی کتبے ہیں جن میں محمد بن سام یعنی شہاب الدین محمد غوری کا نام آیا ہے مسٹر آر۔ این منشی (Mr. R. N. Munshi) ان کتبوں کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ جن جذبات نے التمش سے نچلی منزل کے قاعدہ (Basement) پر قطب الدین ایبک کا نام کندہ کرایا وہی جذبات محمد بن سام کے نام کندہ کرانے کے باعث ہوئے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محمد بن سام کے نام کندہ کرانے کا اصلی محرک التمش کا جذبۂ منت شناسی اور جذبۂ شکر گزاری تھا۔ لیکن محمد بن سام قطب الدین ایبک کا

آقا تھا اور موخرالذکر اسی کی طرف سے مملکت ہند پر حکومت کرتا تھا۔ اس لیے اس کتبہ کو قطب الدین کی طرف منسوب کرنا چاہیے نہ کہ التمش کی طرف جو اپنی تخت نشینی کے وقت غزنی کے زیر فرمان تھا۔ ایلتمش نے مملکت ہند پر اپنی آزادی اور بالادستی کو مستند کرنے کے لیے خلیفہ بغداد سے منشور خلافت حاصل کیا وہ غزنین یا غور کا تابع فرمان نہ تھا ــــ لیکن قطب الدین محمد بن سام کا ایک غلام تھا اس نے موخرالذکر کا نام قطب مینار پر کندہ کرایا جیسا کہ اس نے مسجد قوت الاسلام کے (GATE WAY) صدر دروازہ پر کندہ کرایا تھا۔

لیکن شمس سراج، ابو الفداء، فیروز تغلق اور سکندر لودی کے بیانات کی تردید ابھی باقی ہے۔ بقول کننگھم "ابوالفداء، شمس سراج اور سکندر لودی کے بیانات جو سب کے سب اس مینار کو التمش (ایلتمش) کا مینار قرار دینے میں متفق ہیں ــــ کی تاویل اس طرح کر سکتے ہیں کہ یہ بیانات صرف عوام الناس کی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور یقیناً ان بیانات کو وہ وزن نہیں دیا جا سکتا جو بنیادی منزل کے کتبوں کو جن میں محمد بن سام کے القاب موجود ہیں۔ محمد بن سام قطب الدین ایبک کا جس کا نام مینار کے ساتھ ملحق ہے ــــ مقتدر اعلیٰ تھا۔ میرا خیال ہے کہ نچلی منزل کے کتبہ پر التمش (ایلتمش) کا نام نہ ہونا اس بات کا استقرائی ثبوت (Conclusive Proof) ہے کہ التمش خود بھی اس مینار کے اپنی تعمیر ہونے کا مدعی نہ تھا" یہ دلیل بہت ہی وقیع ہے اور کثرت رائے اسی طرف ہے کہ قطب الدین ہی قطب مینار کا بانی تھا اور وہ (زیادہ سے زیادہ) پہلی منزل ختم کر سکا تھا۔ ایلتمش نے جو اس کا داماد اور جانشین تھا، اپنے آقا کے نا تمام منصوبہ کو پورا کیا۔

بہر حال اتنی بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قطب مینار کو قطب الدین ایبک کی یادگار کے طور پر اس کے نام سے موسوم نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ مینار خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے نام پر قطب مینار کہلاتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اس ستون کے قریب ہی مدفون ہیں اور عوام قطب صاحب کے نام سے پکارتے ہیں وہ خواجہ معین الدین چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔

بطور خلاصہ کلام مسٹر آر۔ این منشی (Mr. R.N. MUNSHI) کہتے ہیں "کچھ لوگ غلطی سے اس مینار کو جس کو ہم قطب مینار کے نام سے جانتے ہیں۔ ایک ہندو راجہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس اسلیتمبھ یا ستون کو پرتھوی راج سے منسوب کرنا ایک مجنونانہ لغویت ہے۔ ایک ہندو راجہ کے لیے ایک ایسے زبردست مینار کی تعمیر کی آخر کیا وجہ یا اسباب ہو سکتے ہیں؟ قطب مینار کا نام جو ردائتاً نسلاً بعد نسلٍ ہم تک چلا آ رہا ہے اس امر کا اثباتی ثبوت ہے کہ یہ ستون شروع سے آخر تک اسلامی تعمیر ہے" علاوہ ازیں زین الدین کا یہ دعویٰ بھی بہت طاقتور ہے کہ قطب مینار کے فنی ماخذ اور اس کے بانی کے بارہ میں جو ثبوت اب تک پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان سے پُر زور اور بہتر ثبوت پیش نہیں جا سکتے جب تک کہ مردے زندہ ہو کر اپنی اپنی قبروں سے نہ اٹھیں اور حلف لے کر اس شاندار تعمیر کے اپنی تعمیر ہونے کا دعویٰ نہ کریں۔

قدیم ہندوستان البیرونی کی نظر میں

جہاں ہندوستان کی خوش حالی اور فراوانی مال و زر نے مختلف ممالک کے فاتحین اور سلاطین کو ہندوستان جنت نشان آنے کی ترغیب دی وہاں اس کے حسن، رومانیت اور افسانوی زندگی کے شہرہ نے اقوام عالم کے سیاحوں کے ذوق جستجو کو اُکسایا۔ ایک طرف فاتحین کے شاندار اور سیاہ کارنامے ہیں تو دوسری طرف علم و ہنر کے شیدائیوں حکمت کے فدائیوں اور صانع قدرت کی گوناگوں عنایتوں جس کا ہندوستان گہوارہ ہے، کے متلاشیوں کے سر پھیرے واقعات، حادثات اور ان کے تاثرات کے اوراق پارینہ ہیں۔

ہندوستان کی قدم بوسی کا شرف ہزارہا سیاحوں کو حاصل ہوا ہوگا۔ مثلاً فاہیان، میگستھنیز سے لے کر برنیر، ٹیورنیر، منوچی اور سلیمین، سب نے اپنی اپنی استعداد، مشاہدہ اور لیاقت کی مناسبت سے ہندوستان کے حالات قلم بند کیے ہیں لیکن ان سیاحوں میں البیرونی سب سے ممتاز، سب سے نمایاں اور سب سے

زیادہ ہندوستان کے قریب نظر آتا ہے۔ ایک درخشندہ ستارہ۔ جیسے ذروں میں آفتاب۔

شیخ ابوریحان البیرونی ستمبر ۹۷۳ء میں خیوا یعنی خوارزم میں پیدا ہوا اور ۱۳ دسمبر ۱۰۴۸ء کو غزنہ میں ۷۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ بیرونی، بیرون خوارزم کی طرف منسوب ہے کیونکہ حوالی شہر خوارزم یا صوبہ خوارزم کا رہنے والا تھا خوارزم کا باشندہ نہ تھا اس لیے اس کو بیرونی کہا گیا۔

بظاہر ابوریحان نے اپنی عمر کے ابتدائی حصہ کو خوارزم میں مویونیدکے ظل عاطفت میں جو خوارزم شاہیہ کے نام سے مشہور ہیں، بسر کیا۔

شیخ ابوریحان چند سال جرجان میں شمس المعالی قابوس کے دربار میں بھی رہے اور اس کے نام پر کتاب آثار الباقیہ تصنیف کی۔

سلطان محمود غزنوی جب فتح خوارزم کے بعد غزنہ واپس ہوا تو ابوریحان کے ساتھ دربار خوارزم شاہی کے تمام فضلاء کو اپنے ساتھ غزنہ لے گیا۔

بیرونی کے دور سے پہلے اگرچہ عیسائیوں، یہودیوں اور پارسیوں کے عقائد اور رسوم پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا اور خود بیرونی نے آثار الباقیہ میں اور ایسی دوسری کتابوں میں ان پر بہت کچھ لکھا ہے تاہم ہندوستان کے باشندوں پر کسی نے اس حیثیت سے نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ عباسی دور میں اگرچہ بہت سی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے ہو چکے تھے اور بہت سے ہندو پنڈت، وید اور فلاسفر دربار خلافت میں پہنچ چکے تھے لیکن جن کتابوں کے ترجمے ہوئے تھے وہ زیادہ تر طب، ریاضی، نجوم اور فلسفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ جن سے ہندوؤں کے

مذہبی خیالات، عقائد، رسوم اور معاشرت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا چند مسلمان بھی اگرچہ شوق علم میں ہندوستان آچکے تھے لیکن انھوں نے بھی اس حیثیت سے ہندوستان کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ بیرونی پہلا شخص ہے جس نے اس غرض سے ہندوستان کا سفر کیا اور اپنی عمر کا، کافی حصہ ہندوستان میں بسر کیا۔ پنجاب اور سندھ کی سیاحت کر کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے علوم و فنون، عقائد و رسوم اور معاشرت اور اخلاق پر تاریخ الهند یا کتاب الہند جیسی بلند پایہ تصنیف کی تخلیق کی۔

یہ وقت ہندوستان کے لیے بہت نازک تھا، مغربی ہندوستان میں محمود کے حملوں کی وجہ سے بڑی پریشانی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ جنگ وجدال کے باعث اہل ہند کے دلوں میں حملہ آوروں اور ان کے تمام ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کی طرف سے معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔ پھر ایسے زمانہ میں ایک غیر قوم اور غیر مذہب اور بالکل اجنبی شخص کو جوان کی نظروں میں ملیچھ یعنی ناپاک تھا اہل ہند کیوں منھ لگاتے ...... اور کیوں کچھ سکھاتے ..... مگر آفریں ہے۔ بیرونی کی ہمت، استقلال اور شوق کو کہ اس نے طرح طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں اس کی ہمت پست نہیں ہوئی۔ برہمن اس کی ذہانت اور علم و فضل دیکھ کر حیرت کرتے تھے اور اسے "ساگر" یعنی علم کا سمندر کہتے تھے۔

بیرونی کئی زبانوں کا عالم تھا۔ فارسی تو اس کی زبان ہی تھی لیکن اس کے علاوہ عربی، عبرانی، سریانی اور سنسکرت پر بھی اسے پوری قدرت

حاصل تھی۔ زبانوں سے زیادہ وہ علوم جانتا تھا۔ بہت کم ایسے علم تھے جن میں اسے کافی دستگاہ نہ تھی۔ طبیعات، منطق، ریاضی، ہیئت، مساحت و ہندسہ، علم المناظر، ارضیات، علم الآثار، علم کیمیا، تاریخ، مذاہب، جغرافیہ اور فلسفہ وغیرہ کا بڑا فاضل تھا۔ لیکن خاص کر ریاضی ہیئت اور جغرافیہ میں اسے تبحر حاصل تھا۔

ابوریحان کی تصنیفات کے سرسری مطالعہ سے بھی اس کے عقیدہ اور مشرب کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ ابوریحان صرف حقیقت پرست تھا اور کسی چیز کو دنیا میں اس پر ترجیح نہیں دیتا تھا اور اس نے حقیقت کو کسی دوسری غرض سے نہیں چھپایا۔ وہ مسلمان تھا اور شیعیت کی طرف مائل تھا لیکن متعصب، متشدد اور خشک مسلمان نہ تھا۔ اس کے حلقۂ احباب میں عیسائی، یہودی، زردشتی، ہندو غرض ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ تھے۔

البیرونی کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اس نے مختلف علوم و فنون پر ایک سو چودہ سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

یہاں ہم صرف کتاب الہند پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔ کتاب الہند میں ہندوستان کے مذہب، فلسفہ، ادب، جغرافیہ، ہیئت، جوتش رسم و رواج اور قوانین کا بیان ہے۔ ان امور کے بیان میں اس نے بڑی صداقت اور ایمانداری سے کام لیا ہے۔ وہ حق کے اظہار میں کبھی نہیں چوکتا اس کا نقطۂ نظر حکیمانہ ہے اور تعصب کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ جہاں وہ اہل ہند کے بعض عیوب پر حرف گیری کرتا ہے وہاں وہ ان کی خوبیوں کو بھی دل سے

مرا ہتا ہے۔

قیام ہندوستان کے دوران اسے جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اس سلسلہ میں بیرونی لکھتا ہے:۔

ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک، انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ، بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ۔ دین ہے تو وہی جو ان کا مذہب ہے۔ اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے .... اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دنیا میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے ماسوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے"

اتنا کچھ لکھنے کے بعد وہ نہایت انصاف سے لکھتا ہے:۔

"بایں ہمہ ان کے اسلاف اس درجہ بے خبر نہ تھے"

عام طور پر مذکورہ بالا اقتباس سے بیرونی کی مشکلوں اور دقتوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو یہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے ہندوستان اور اس کے باشندوں کے مزاج اور ذہنیت کی پوری عکاسی ہے۔ جس نے ہندوستانیوں کو کنویں کا مینڈک بنا کر رکھ دیا تھا۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ بین الاقوامی سیاست کا کیا رنگ، کون سا رخ اور کدھر جھکاؤ ہے اگر ہندوستان کے لوگ یہ جانتے ہوتے تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ جہالت اور تنگ نظری اس معمہ کا واضح حل ہے کہ مسلمانوں کی یلغار کے آگے اہل ہند کے

پاؤں یکا یک کیوں کر اور کیسے اُکھڑ گئے۔

ہندوؤں کے متعلق یہ عام نظریہ ہے کہ وہ بُت پرست ہیں لیکن بیرونی نے جہاں ہندوؤں کے بتوں پر بحث کی ہے وہاں صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ ہندوؤں کے عوام کا مذہب ہے۔ خواص اور محققین صرف توحید کے قائل ہیں۔ بیرونی صرف ہندوؤں کے عقائد اور خیالات نقل کرتا ہے لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسرے مذاہب کے عقائد و خیالات بھی نقل کرتا ہے تاکہ باہمی مشابہت یا اختلاف سے موضوع زیر بحث زیادہ صاف اور واضح ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ توحید کا شیدائی اور اسلام کا نام لیوا، بیرونی آگے چل کر یہ بھی بتلاتا ہے کہ "بت پرستی عوام کی طبعی حالت ہے"۔

نکاح اور ازدواج کے بارے میں جہاں البیرونی یہ لکھتا ہے کہ "شمالی مغربی پہاڑی علاقہ کے باشندے چند بھائیوں کے درمیان اگر وہ حقیقت میں بھائی ہوں ایک عورت کا مشترک ہونا فرض قرار دیتے ہیں"۔ وہاں وہ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں بھی اسی قسم کے کئی نکاح ہوتے تھے۔

ویدوں کے بارے میں بیرونی بیان کرتا ہے:۔

"برہمن بغیر مطلب سمجھے ہوئے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس طرح اس کو آپس میں سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ ان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس کی تفسیر جانتے ہوں اور ایسے لوگ اور بھی کم ہیں جو استدلال اور مناظرہ کے طریقے پر اس کے معانی اور مطالب میں غور و فکر کرتے ہوں"۔

ہندوستانی سماج کی تصویر کشی نہایت ہی جاندار ہے۔ بیرونی

نے ہندوؤں کے چار ابتدائی طبقات یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے ساتھ ساتھ ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی بھی پیشہ کے اعتبار سے پوری تفصیل دی ہے۔

البیرونی ہر مسئلے کو قوانین فطرت اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے وہ مقلد نہیں بلکہ مجتہد تھا۔ کتاب الہند کا مصنف پہلا مسلمان مورخ ہند ہے جس نے تاریخی اصولوں کو برتا اور تحقیقی قدروں کی شمع روشن کی۔ ایسی شمع جو ہر مورخ کے لیے مشعل راہ ہے۔ البیرونی ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ بین اقوامی ترجمان ہے۔ عہد نو کا نقیب اور معمار بھی۔

(لکھنؤ سے براڈ کاسٹ)

---------- بدبد ----------

گاندھی جی تاریخ کی روشنی میں

(ایک جائزہ)

گاندھی جی کی زندگی اور گاندھیائی فلسفے سے متعلق دفتر کے دفتر سیاہ کردیئے گئے ہیں اور ان کے نظریوں اور اصولوں کے شارح اور رہبر و نہ صرف ہندوستان ہی میں ہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے طالب علم کو جس کی حب الوطنی شمع آزادی کے پروانوں سے کسی بھی حالت میں کم تر قرار نہیں دی جاسکتی۔ گاندھی جی پر قلم اٹھانے سے پہلے کافی غور و خوض کرلینا چاہیئے اس لیے کہ مسیحائے ہندوایشیا کے بہت سے خواب شرمندۂ تعبیر ہونا باقی ہیں۔ اس لیے گاندھی جی کی مدبرانہ شخصیت پر تبصرہ کرنا اور تاریخ میں ان کا صحیح مقام متعین کرنا قبل از وقت ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی خوف ہے کہ کہیں ملک باپو کے دکھائے ہوئے راستہ سے ہٹ نہ جائے ایسی صورت میں ان کی شخصیت کا صحیح پتہ لگانا اور تاریخ میں ان کی صحیح جگہ متعین کرنا صرف ماہرین آثار قدیمہ کے ذمہ چلا جائے گا۔ جہاں تک ہندوستان کی تاریخ کا تعلق ہے گاندھی جی کا مرتبہ

بہ اعتبار ترتیب زمانی تیسرے نمبر پر ہے — اشوک، اکبر اور مہاتما گاندھی۔ لیکن اس ترتیب کی تاریخی حیثیت بہ اعتبارِ فضیلت ہر حالت میں محتاجِ ثبوت ہے۔

اشوک کا کردار:

مہاراجہ اشوک صحیح معنوں میں بادشاہت سے متعلق آریائی تصورات کا نمونہ تھا۔ وہ اپنی رعیت کا مشفق باپ، رہبر اور محافظ تھا۔ اس کے انتظام سلطنت کی اساس انسانی قدروں پر تھی جس کا مقصد رعایا کی روحانی زندگی کو بلند سطح پر لے جانا تھا۔ اس کی شخصیت بیک وقت ایک مہاراج دھیراج اور مذہبی پیشوا کا مرکب تھی لیکن طبعًا پہلے وہ روحانی رہنما تھا پھر کہیں زمینی قوتوں کا مالک۔ اشوک بدھ مذہب کا ماننے والا تھا جو اسلام اور مسیحّیت کے مانند ایک تبلیغی مذہب ہے۔ گوتم بدھ کے اصولوں اور فلسفۂ حیات پر سختی سے کاربند اشوک نے بدھ مذہب کی اشاعت اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالیا تھا مگر ساتھ ساتھ اس عظیم شہنشاہ میں بلا کی رواداری تھی اس کے دورِ حکومت میں عوام کے ضمیر کو مکمل آزادی حاصل تھی اور جیسا کہ تاریخ شاہد ہے اشوک نے کبھی بھی مذہبی مظالم کو گوارا نہیں کیا اور اپنے مذہب کی اشاعت کے سلسلہ میں خونِ ناحق سے اپنے ہاتھوں کو کبھی بھی آلودہ نہ کیا۔ اس ضمن میں اشوک کے ایک مؤرخ کے بیان کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

" بادشاہت کے تذکروں میں ایسی کسی ہستی کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے جس کا موازنہ اشوک سے بہ حیثیت حاکم اور بہ حیثیت انسان کیا جاسکے۔ مورخین نے اشوک کی عظمت کے خصوصی خدوخال کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اس کا مقابلہ و موازنہ تاریخ

کے دوسرے ممتاز حکمرانوں جن میں مشرق و مغرب کے عہد قدیم و عہد جدید کے عیسائی مسلم اور بت پرست حکمراں شامل ہیں، سے کیا ہے۔

دینی حکومت کے بلند ترین تصورات کے مطابق اشوک کی قائم کی ہوئی نیکی کی حکومت صیہونیت کے عروج کے ایام میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کی قائم کردہ اسرائیلی حکومت کے مثل قرار دی گئی ہے، بدھ مت کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس کا بے پناہ جذبہ اور ایک مقامی فرقہ کو عالمی مذہب بنانے کے لیے اس کی انتھک کوششیں صرف قسطنطین اعظم ہی میں ملتی ہیں جس نے عیسائی مذہب کے پھیلانے کا کام اپنے فرائض منصبی میں داخل کر لیا تھا۔ اشوک کا فلسفہ اور اس کا زہد ہمیں مارکس اوریلی یس کی یاد دلاتا ہے۔ جہاں تک حدود سلطنت اور اس کے حسن انتظام کا تعلق ہے اشوک شارلیمان سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے فرمان اولیور کرامویل کی مخصوص لب و لہجہ کی حامل تقریروں سے مشابہ ہیں۔ اشوک کا موازنہ خلیفہ عمر اور شہنشاہ اکبر سے کیا گیا ہے جن سے وہ چند باتوں میں مماثلت رکھتا ہے (رادھا کمد مکرجی ۔ گائیکواڑ لیکچرس)

مذکورہ بالا بیان میں اگرچہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اشوک اعظم کا سابقہ ان پیچیدہ حالات سے نہیں پڑا جو اسلام کی آمد سے ہندوستان میں پیدا ہو گئے تھے۔ ہمارے ملک میں اسلام کی آمد ہماری تاریخ کا ایک نیا اور انوکھا باب ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ابتک ایک ایسے مسطح اور خاموش دھارے کے مانند تھی جو اپنی منزل کی طرف ہولے ہولے بڑھ رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے آنے سے ایک ارتعاش سا پیدا ہوا اور اس دھارے نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا۔

مہاراجہ اشوک اور اکبر اعظم:

مہاراجہ اشوک کے بعد اس تاریخ کا دوسرا اہم کردار اکبر اعظم ہے جسکی عظمت محض اس وجہ سے نہ تھی کہ اس کی افواج ایک سیل رواں تھیں اور نہ اس وجہ سے کہ اس کے زیر نگیں دور دراز کے ممالک تھے اکبر کو اکبر اعظم محض اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنے سوچے سمجھے قومی اتحاد کے مقصد کے تحت منقسم ہندوستان کو ایک سیاسی اکائی میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ عظیم مغل شہنشاہ محض اپنی سیاسی و انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر عظیم نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے ان گنے چنے مدبروں میں سب سے اونچی جگہ لے لیتا ہے جنہوں نے ہندوستان جیسے ملک کی ان گنت معاشرتی اکائیوں کو متحد کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں لیکن یہ عین بدقسمتی ہے کہ اس کی وفات کے بعد فوراً ایک ردِ عمل ہوا اور عنانِ حکومت کٹر اور متعصب ہاتھوں میں چلی گئی۔ لارڈ نارتھ بروک نے مندرجہ ذیل لفظوں میں اکبر کو اس کی آخری آرام گاہ سکندرہ میں یوں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

"اگر اس کی (اکبر کی) حکمت عملی پر عمل کیا جاتا رہتا تو ہم لوگوں کو ہندوستان آنے کی مطلق ضرورت نہ تھی ــــــ"

اب ذرا اکبر اور اشوک کا موازنہ کر لیا جائے۔ اشوک کا کام یکسر تبلیغی تھا اور اس کی زندگی کا واحد مقصد "ایشیا کے نور" کی تقلید کرنا تھی۔ اشوک محض انسانیت کا پرستار تھا، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا گو وہ بظاہر شاہانہ شان و شوکت سے رہتا تھا اس کا سامنا ان مشکل حالات سے نہیں ہوا جو اکبر کے لیے مخصوص کر دیئے گئے تھے

اکبر کو منزل کی لشاندہی کرنے والا ابھی کوئی نہ تھا۔ وہ منزل جو تنگ نظری تعصب اور مذہبی کش مکش کو ختم کر دینے ہی پر مل سکتی تھی۔ چنانچہ اس کا راستہ نسبتاً زیادہ پر خار اور پر پیچ تھا اس لیے اکبر کی کوششیں اور بھی زیادہ قابلِ تحسین اور اس کی کامیابی نسبتاً زیادہ لائق ستائش ہے۔ ہو سکتا ہے اس موازنہ سے کوئی یوں متفق نہ ہو کہ یہ دونوں ہستیاں دو مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ صحیح ہے مگر یہ خیال ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دونوں بادشاہ ہندوستان کے معاشرے اور حکومت کو بہتر بنانے کا عزم لے کر کھڑے ہوئے تھے تاکہ حکومت عوام کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بن جائے۔ اس سے ان حکمرانوں کی اپنی انفرادی کامیابی تاریخ میں ان کے مقام کا تعین کر دیتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے حاکموں میں اگر کوئی اشوک کی ہمسری کرتا ہے تو وہ ہے اکبر۔

گاندھی جی اور اشوک:

بدھ کے بعد ہندوستان نے جس عظیم ہستی کو جنم دیا وہ ہیں گاندھی جی جن کی شخصیت میں بیک وقت تینوں یعنی گوتم بدھ۔ مہاراجہ اشوک اور اکبر اعظم کی روحیں کارفرما ہیں۔ گاندھی جی حکمراں نہ ہوتے ہوئے بھی کروروں دلوں پر سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ سابرمتی کے اس سنت پر نہ تو کسی مہانے سایہ ہی کیا اور نہ کوئی خسروی شامیانہ میسر ہوا لیکن اس کے سر کو محیط کرنے والا ہالہ اسے آفاق کی اس بلندیوں پر لے جاتا ہے جہاں گنے چنے ہی انسان پہنچے ہیں۔ یہ سمجھنا قطعی طور پر غلط ہے کہ گاندھی جی نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کی تقلید کی حالانکہ یہ بھی غلط نہیں کہ انھوں نے بدھ مت کی کئی بنیادی باتوں کو اپنایا لیکن گاندھی جی

کی یہ انفرادیت ہی تھی کہ انھوں نے ہر اس جگہ اپنی تشنگی بجھائی جہاں سے ان کو ان کے مطلب کا مشروب مل سکا۔ ان کے فلسفۂ حیات کے سرچشمے صرف وہی مشرق کی روحانی قدریں ہیں جو مغرب کی عقلیت کی کسوٹی پر ٹھیک اتریں اس سلسلے میں مہاراجہ اشوک گاندھی جی کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا کیونکہ انھوں نے ایک الگ مکتب خیال قائم کیا اور سوچنے سمجھنے کے نئے نئے طریقے دریافت کئے اس کے علاوہ اشوک حملہ شاہی کروفر کو ساتھ لیکر بھی جس منزل تک نہیں پہونچ سکا اس کو گاندھی جی محض اپنی عجوبہ روزگار شخصیت کے سہارے بارہا پامال کر گئے۔

گاندھی جی اور اکبر اعظم

روحانیت، بھگتی اور صوفی تحریک کے میدان میں گاندھی جی اور اکبر کا الگ الگ مقام ہے۔ اکبر نے دین الٰہی کو رواج دے کر اسلام میں صوفی تحریک کی قلم لگانا چاہی تھی جب کہ گاندھی جی نے بھگوت گیتا پر مبنی ویدک دھرم کی بنیاد پر بنی آدم کی آفاقی اخوت کی تحریک کا آغاز کیا اس نئے مکتب خیال کا معبود وحدت کا حامل ہے اس میں دوئی کی بو نہیں وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اپنے پجاریوں کو تخصیص کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ مگر اکبر اور گاندھی جی کے مقاصد جدا جدا نہیں ہیں اکبر نے کہا ہے۔

"ہم کو چاہئے کہ ان سب کو (جملہ مذاہب کو) ایک مقام پر لے آئیں مگر اس خوبصورتی سے کہ سب اکٹھے تو ہو جائیں مگر کوئی بھی مذہب اپنے بہتر عنصر نہ تلف کر دے جبکہ دوسرے مذاہب کے تمام اچھی چیزیں اپنے میں سمولے اس طریقہ پر ہم اپنے معبود میں ایک نیا اور ناقابل تزلزل ایمان پائیں گے

اس کی مخلوق کو امن، صلح اور آشتی کا ایک نیا ماحول ملے گا اور سلطنت اور زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔"

یہ سیاست کا میدان ہی ہے جہاں گاندھی جی اور اکبر کی حیثیت میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اکبر نے چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹی پوری ہندوستانی قوم کو برابری محبت اور بھائی چارے کے اٹوٹ رشتے میں جکڑ کر مادر وطن کو ایک مقدس بھینٹ دینا چاہی تھی جس کے لیے اس نے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بنایا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے اسلاف کی مذہبی نابرابری، تعصب اور تنگ نظری سے بھرپور پالیسی کو یک لخت ترک کر دیا اس کا ایمان تھا کہ ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ منتظمہ میں غیر مذہبیت داخل کی جائے اس لیے اس نے سیاست کے میدان میں مذہب کی قوتوں سے مطلق کام نہ لیا اور اس کو پس منظر میں محبوس کر دیا یہ ہندستانیوں کو ایک قوم میں تبدیل کرنے کا مقدس فریضہ ہی تھا جس کے لیے اس عظیم شہنشاہ نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ حالانکہ اس کی وفات کے بعد اس کی اسکیمیں ترک کر دی گئیں پھر بھی تاریخ گواہ ہے کہ مغل حکومت اپنی پراگندگی اور مرکزی انتشار کے باوجود پورے ڈیڑھ سو سال بعد ختم کی جا سکی۔ مغل حکومت کی یہ سخت جانی اکبر کی قومی پالیسی کا نتیجہ نہ تھی تو اور کیا تھی؟

مہاتما کی منزل

مغل حکومت کے خاتمہ اور حصولِ آزادی کے درمیان کا وقفہ قومی نقطۂ نظر سے ہندوستان کا تاریک ترین عہد ہے۔ اس دور کی جاں گداز کہانی کہنے کے لیے داستان گو کی آواز تھرتھرا اٹھتی ہے اور پھر اس سیاسی ادر

ذہنی غلامی کے دور کی صبر آزما داستان کو دہرانے میں چنداں فائدہ بھی نہ ہوگا۔

اس سیاسی انتشار، قومی افراط و تفریط اور ذہنی تغیرات کے زمانے میں ایک مسیحا آیا جس نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ دیش اور قوم کو اس کی گذشتہ قومی عروج کی منزل پر پھر سے پہونچا دیا۔ یہی گاندھی جی کے خواب کی تعبیر ہے کہ آج ہندوستان کے سبھی باشندے رنگ و نسل، زبان و معاشرے، اور اور رسوم مذاہب کے تمام قید و بند سے آزاد ہو کر بیک زبان کہتے ہیں کہ ہم ہیں آزاد ہندوستان کی جمہوریہ کے معزز شہری اور تقسیم عظیم جو آبادی کے ایک بڑے حصے کے کل سے الگ ہونے کے نظریاتی دعوے کو عملی جامہ پہنانے کے جنون کا رد عمل ہے در اصل اس غیر ملکی حکومت کا اس عظیم برصغیر پر آخری اور بھرپور وار ہے جو ہماری خوش حالی، بہتری اور بہبودی ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہ وہ گھناؤنا جرم سرزد ہوا ہے جس کو صدیوں تک ہماری نسلیں کسی نہ کسی صورت میں بھگتا کریں گی اور یہ کمال وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری موجودہ نسل مادرِ وطن کو تقسیم کر کے جس عظیم گناہ کی مرتکب ہوئی ہے شاید ہی ہماری بعد کی نسلیں اس کا کفارہ ادا کر سکیں ، اپنے جسم اور جان نچھاور کرنے کے بعد بھی۔

گاندھی جی کے اختلاف کے باوجود یہ تقسیم ہمارے اوپر مسلط کر دی گئی۔ آخر کیوں؟ اس کا تسلی بخش جواب تو تاریخ کے محققین کی انتھک کوششوں کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے لیکن فی الوقت جو کچھ بھی ہندوستان کہلاتا ہے غیر مذہبی جمہوریت پر مبنی گاندھی جی کی تعلیمات اور تجربات پر عمل کرنے کے لیے کافی ہے

گاندھی جی آفاقی اخوت اور رواداری کے علمبردار تھے اس ضمن میں انھوں نے اکبر سے استفادہ حاصل کیا مگر اکبری دور کے زریں اصول، اصلاحات اور بالغ نظری کو نئے اور وسیع میدان مہیا کیے۔

گاندھی جی اکبر اعظم سے عظیم تر

یہ کہنا غلط ہوگا کہ گاندھی جی نئے ہندوستان کی حکومت میں کسی عہدہ پر مامور نہ تھے اگر حقیقت نظری سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ حالانکہ سیاسی و عملی طور پر حکومت کے سربراہ نہ تھے مگر نئے ہندوستان کے پالن ہار ضرور تھے ان کی تعلیمات حکومت کے ہر شعبہ کے لیے مشعل راہ کا کام کرتی تھیں۔ مقننہ اور منتظمہ دونوں ان کے اشارے پر چلتی تھیں جس کا براہ راست اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی عوام میں خود اعتمادی آگئی ان میں اتنا شعور آگیا کہ وہ اپنے ضمیر پر کسی قسم کا ظلم نہ کرتے ہوئے اپنے کو اس عظیم جمہوریہ کی ایک اکائی سمجھنے لگے۔ اگر ہندوستان غیر ہندو عناصر سے پاک ہونے کے بعد ہی ایک قومی مملکت ہونے کا دعویٰ کرتا تو مستقبل کا مورخ اس واقعہ کو محض دوسری یا آخری صورت کہنے پر مجبور ہو جاتا جو واقعی قابل تعریف بات نہیں ہو سکتی تھی یہی نہیں بلکہ قدیم ہندوستانی روایات اور مزاج سے سراسر انحراف اور فرار کہا جاتا۔ گاندھی جی چلتے چلتے مذہبی جنون، زبردستی، فرقہ داریت اور تنگ نظری کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیے گئے حالاں کہ ابھی ان کے زیادہ تر مقاصد پورے نہیں ہوئے تھے انھوں نے اپنے مقدس مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے

اپنی جان عزیز بھی جان آفریں کو نذر کردی تاکہ ابدی سکون کی طرف جانیوالا راستہ ہموار ہو سکے۔ یہ راستہ گو کہ ان کا دریافت کردہ نہ تھا لیکن یہیں وہ اکبرِ اعظم سے بازی جیت گئے اس لیے کہ انھوں نے ہندو مسلم دونوں فرقہ واریت کے بھیانک راکشسوں سے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی یہ انھیں کے سے منحنی جسم مگر غضب کی قوتِ ارادی رکھنے والے آدمی کا کام تھا۔ آیا گاندھی جی کی شہادت کا واقعہ محض اس ملک کی تاریخ کے ایک باب کا خاتمہ ہے جہاں کے باشندے ایک قوم کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ تاریخ نے اپنا فیصلہ ابھی محفوظ رکھا ہے۔

لکھنؤ کی صنعت و حرفت

گلزاروں اور مرغزاروں کا شہر، لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں اور عاشق ناشاد کا جگر کی آوازوں کا دیار، مرثیہ خواں اور نوحہ کناں کوچہ و بازار کا گہوارہ، نوابین اور شاہان اودھ کے خواب کی تعبیر، شعر و شاعری کا مسکن۔ لالہ رخان اور ماہ وشاں کا لکھنؤ، صنعت و حرفت میں بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

لکھنؤ زمانہ قدیم سے اپنی صنعت و حرفت کے لیے مشہور رہا ہے۔ سترھویں صدی کا علیحدگی کے اوائل سے یہاں کی تیار شدہ چیزیں یورپ میں مقبول ہونی شروع ہو چکی تھیں دہلی سلطنت کے زوال کے بعد اہل حرفت نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور یہاں پر نوابین اودھ نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ لکھنؤ کی رونق سے باہری سیاح مبہوت ہو جاتے تھے ہوبح، ارچر اور ہیر منڈی کی آنکھیں لکھنؤ کی صنعت و حرفت اور اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر خیرہ ہو ہو گئیں۔

لکھنؤ کی صنعتوں میں چکن، کامدانی، ہاتھی دانت کا کام، زردوزی اور

مٹی کے کھلونے زیادہ مشہور رہیں۔ ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی دوسری صنعتیں بھی ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

چکن کا کام اودھ کے نوابوں کے زمانہ میں بہت ترقی پذیر تھا نوابوں کو ایسے کپڑے پہننے کا شوق تھا جن پر گل بوٹے بنے ہوئے ہوں۔ شاید یہ ایرانی تہذیب کا اثر تھا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا گرم ہے۔ بھاری کپڑے جن پر سونے اور چاندی کا کام کیا ہو گرمیوں میں ناقابل استعمال ہوتے ہیں۔ تنزیب، آب رواں اور ململ موسم گرما میں خاص طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیب و زینت کا شوق اور موسم کی ستم ظریفیوں نے مل کر چکن کے کام کو جنم دیا۔

چکن کا کام بغیر بٹے ہوئے دھاگے سے بنایا جاتا ہے۔ چکن میں مختلف طرح کے ٹانکے لگائے جاتے ہیں۔ مری یا منڈی میں دھاگے کو اس طرح سلتے ہیں کہ ایک مستطیل ڈلا جس کی شکل گاجر کی ہوتی ہے بن جاتا ہے۔ بخیہ پھیلی شکل کی مانند ہوتی ہے۔ لیکن بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ جالی کا کام کپڑے ہی کے دھاگوں کو کھینچ کر اور ملا کر بناتے ہیں۔ جب کسی چیز کی تمثیل بناتے ہیں تو اسے پیچی یا پٹا کہتے ہیں۔ دھم میں ٹانکے داہنی طرف لگائے جاتے ہیں جو کپڑے پر دھند کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کٹاؤ میں مختلف رنگ کے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اصل کپڑے میں سل کر نقش و نگار بنا دیتے ہیں۔

ان تمام کاموں میں دھم، کٹاؤ، مری اور جالی زیادہ مہنگے ہیں۔ اس صنعت کا مرکز چونکہ لکھنؤ ہے کام کرنے والے شہر اور آس پاس کے دیہاتوں میں

بھی رہتے ہیں جن میں ملیح آباد، کاکوری، اٹو نجا اور گوشائیں گنج زیادہ مشہور ہیں
چکن کی صنعت کو بڑھاوا دینے اور دوبارہ زندہ کرنے کی غرض سے حکومت یو، پی
نے ۱۹۴۷ء میں "گورنمنٹ چکن امپرو اڈری اسکیم" نافذ کی۔ اس اسکیم کا مقصد ہے کہ کاریگروں
کو مستقل اور مناسب مشاہرہ پر ملازمت دی جائے، کام کا معیار اوپر اٹھایا جائے اور
بیرون ہند تیار شدہ مال کی کھپت میں سہولت پیدا کی جائے۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھ کر
تجارتی اصولوں پر مال تیار کرائے جاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے کام مہیا کیا
جاتا ہے۔ کاریگروں کی بھرتی امتحان لینے کے بعد کی جاتی ہے جو ماہر کاریگروں کی زیر نگرانی
کام کرتے ہیں۔

اس لیے موجودہ صورت حال یہ ہے کہ چکن کی صنعت دو حصّوں میں تقسیم ہے ایک
تو وہ جو حکومت کے ماتحت ہے اور دوسری جسے لوگ نجی طور پر کرتے ہیں۔ یا دوکاندار
اور تھوک فروش بیوپاری کراتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر ساریاں، کرتے
اور بلاؤز کے کپڑے بناتے ہیں۔

کامدانی کا کام چکن ہی کے مانند ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کامدانی کا کام سونے اور
چاندی کے تاروں سے کیا جاتا ہے۔ پھول اور ستارے، ساٹن یا عمدہ سوتی
کپڑوں پر کاڑھے جاتے ہیں۔ کاریگر چپٹے تاروں کو لے کر جنھیں دنیوالی کہتے ہیں
سوئی کی مدد سے بخیہ گری کرتے ہیں۔ چکن کی طرح کامدانی کا کام بھی ہاتھوں ہی
سے ہوتا ہے اور اس کے لیے فرمے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اس کام کی قیمت
تاروں کی قیمت پر منحصر ہوتی ہے۔ اصلی چاندی اور سونے کے تار زیادہ دن
تک چلتے ہیں اور کافی مہنگے پڑتے ہیں۔ اسی لیے معمولی قسم کے تار عموماً استعمال

ہوتے ہیں۔ کامدانی کے لیے جو مخصوص قسم کے تار استعمال میں آتے ہیں۔ انھیں بادلہ کہتے ہیں۔

اصلی اور نقلی تاروں کی سب سے آسان پہچان یہ ہے کہ تار کا ایک ٹکڑا لے کر جلا دیا جائے اگر تار اصلی دھات کا بنا ہوا ہے تو فوراً ہی پگھل جائے گا لیکن نقلی تار کوئلہ کی شکل اختیار کر لے گا اور مسلنے سے کالے رنگ کا سفوف بنجائے گا۔

زردوزی کامدانی کی عمدہ قسم کا نام ہے جو سونے کے تاروں سے ساٹن، ململ، مخمل، جارجٹ، کریپ، اور نائی لان پہ بنایا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے فرموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جنھیں کار چوب کہتے ہیں۔ زردوزی کام کی اُجرت کامدانی اور چکن کے مقابلہ میں زیادہ پڑتی ہے۔ مخمل پہ زردوزی کا کام بہت رائج اور مقبول عام ہے۔ زردوزی کے عمدہ قسم کے ناگرہ یا سلیم شاہی جوتے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ جو زیادہ تر شادی بیاہ کے موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔

زردوزی کا کام زیادہ تر کارخانوں میں ہوتا ہے۔ اس لیے عام طور پر مرد کام کرتے ہیں حالاں کہ تھوڑی بہت تعداد عورتوں کی بھی اس صنعت سے وابستہ ہے۔ اس وقت لکھنؤ میں تقریباً چونسٹھ ۶۴ زردوزی کے کارخانے ہیں۔ زیادہ تر سامان بڑے بڑے شہروں مثلاً ممبئی۔ کلکتہ، مدراس یا دہلی کو بھیجا جاتا ہے اور وہاں سے پھر یہ چیزیں غیر ممالک خصوصاً جنوبی افریقہ، سیلون، کناڈا، اور دوسرے یورپی ممالک کو روانہ کی جاتی ہیں۔

کامدانی اور زردوزی کے لیے سونے اور چاندی کے تار ضروری ہوتے ہیں۔ اس لیے تار کشی بذات خود ایک صنعت ہے۔ سونے یا چاندی کے ٹکڑوں سے

دھاگے سے زیادہ باریک تار بنانا ایک مشکل فن ہے جسے اہل لکھنؤ نہایت نفاست سے انجام دیتے ہیں۔ ان تاروں کو لچکا، کلابتو وغیرہ کہتے ہیں۔

گوٹہ سونے اور چاندی کے تاروں کو کپاس یا ریشم کے دھاگوں کے ساتھ بن کر بناتے ہیں۔ گوٹہ کو ہندوستانی عورتیں پوشاک، میز پوش اور خوان پوش کے حاشیہ کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ گوٹہ کارخانوں اور گھروں دونوں جگہ تیار کیا جاتا ہے۔ سستے مال کی مانگ کی وجہ سے آج کل عموماً نقلی گوٹہ زیادہ بنایا جاتا ہے۔ گوٹہ کی صنعت خصوصاً زوال پذیر ہے کیونکہ عوام کا مذاق بدلتا جا رہا ہے۔

سونے اور چاندی کے ورق کب سے بننا شروع ہوئے اس کے بارے میں کچھ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا غالباً غلط ہوگا کہ اس صنعت کا تعلق مسلم تہذیب کی نفاست سے ہے۔ سونے یا چاندی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جھلی میں جو خاص طور پہ آگرہ میں تیار ہوتی ہے رکھ کر نہائی پر ہتھوڑے سے کوٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ٹکڑے نہایت ہی باریک اور نفیس ورقوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ورق پان اور مٹھائیوں کے اوپر لگانے کے کام آتے ہیں۔ حکیم لوگ اس کا استعمال دوا میں بھی کراتے ہیں۔ اس وقت لکھنؤ میں ایسی تقریباً گیارہ دوکانیں ہیں جہاں چاندی اور سونے کے ورق بنائے جاتے ہیں۔ سال میں لگ بھگ چھ ہزار گڈیاں تیار ہوتی ہیں اور پچھتر فیصدی مقامی طور پر استعمال ہو جاتی ہیں۔

بتی ملیح آباد میں بنائی جاتی ہے ایک سیر سیسہ میں پیسہ بھر تانبہ ملا کر گلاتے ہیں۔ اور پھر اس کے ڈنڈے بنا لیتے ہیں۔ ڈنڈوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں

کاٹ کر کوٹتے ہیں۔ پنی سگریٹ اور صابن کے پیکنگ میں کام آتی ہے چوڑیوں اور ہار بنانے میں بھی پنّی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پنی خاص طور پر تعزیہ بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

سفید پنّی کے علاوہ رنگین پنی بھی بنانے کا رواج ہے۔ رنگین پنیاں کچی اور پکّی دونوں طرح کی بنائی جاتی ہیں۔

زوال پذیر صنعتوں میں ہاتھی دانت کا کام بھی ہے۔ اس صنعت کی ابتدا کچھ مسلمان مہاجروں سے ہوئی جو جے پور اور دہلی سے لکھنؤ آکر آباد ہوئے اور نوابین اودھ نے ان کی سرپرستی فرمائی۔ اس وقت صرف پچاس کے قریب کاریگر اس کام کو کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ لوگ پوڈر کے ڈبے، چھریاں، لیمپ اسٹینڈ، بٹن اور چھوٹے چھوٹے کھلونے بناتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہاتھی دانت اور ہڈیوں سے بنائی جانے والی چیزوں کے صرف دو کارخانے ہیں جو سال میں لگ بھگ ساٹھ ہزار روپیہ کا سامان تیار کرتے ہیں جنھیں بمبئی، کلکتہ، دہلی جے پور، وارانسی اور آگرہ بھیجتے ہیں۔

کپڑوں کی چھپائی کے لیے بھی لکھنؤ مشہور ہے۔ عموماً ساٹن، ٹوئیل اور لانگ کلاتھ یا مارکین پر چھپائی ہوتی ہے۔ اس وقت لکھنؤ میں اس طرح کے تقریباً پینتالیس کارخانے ہیں اور سال میں تقریباً سات لاکھ روپیہ کی مالیت کا سامان تیار ہوتا ہے۔ عام طور پر لحاف، میزپوش، پردے، تکیہ غلاف اور چادریں تیار کی جاتی ہیں۔ لحاف جو ساٹن یا ٹوئیل پر چھاپ کر تیار کیا جاتا ہے وہ کسی صورت میں فرخ آباد کے لحافوں سے کمتر نہیں ہوتا ہے۔

لکھنؤ کی نزاکت، فنکاری اور نفاست دیکھنی ہو تو یہاں کے مٹی کے کھلونے دیکھیئے۔ یہاں نہ صرف پھل اور ترکاریوں کے نمونے بنائے جاتے بلکہ بازار، بارات یا ایک پورے گاؤں کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ کیلے کی پوری چھال سے لے کر ناشپاتی تک مٹی کے ایک ہی تودے سے بناتے ہیں۔ مضبوطی کے لیے اندر اندر لوہے کے تار دوڑا دیئے جاتے ہیں۔ کھلونوں کو پکانے کے بعد چار پانچ مرتبہ کھریا مٹی لگائی جاتی ہے تب کہیں جاکر اسے وارنش سے رنگتے ہیں۔ لکھنؤ میں ایک خاص قسم کی ہلکے بھورے رنگ کی مٹی ملتی ہے جو ان کھلونوں کے بنانے میں کام آتی ہے ۱۹۲۳ء میں صرف تین اشخاص باقی رہ گئے تھے جو اس فن کو جانتے تھے۔ فی زمانہ "آرٹس اینڈ کرافٹ اسکول" کی کوششوں سے یہ ہنر ناپید ہونے سے بچ گیا ہے معمولی کمہار اپنے فن کا مظاہرہ ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی اور دوسرے تہواروں کے موقعوں پر کرتے ہیں۔

لوہے پر سیاہ پالش کرکے چاندی سے میناکاری کا کام صرف لکھنؤ کے ایک گھرانے میں ہوتا ہے۔ یہ بڑا نازک فن ہے اور مضبوطی اور خوبصورتی میں بھی لاثانی ہے۔ سیاہ پس منظر پر سفید پچیکاری عجیب لطف پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ کھلونے سگریٹ کیس، قلمدان وغیرہ بناتے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ ہنر بیدر یعنی دکن کی بہمنی سلطنت کی راجدھانی سے یہاں آیا ہے۔

لکھنؤ کی صنعت و حرفت فی زمانہ زوال پذیر ہے۔ زوال کے مختلف اسباب ہیں۔ آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر نے ۱۸۵۷ء کے فرمان میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ یورپ کے

"صنعتی انقلاب" کا ثمرہ بھی لائے۔ ہاتھ کی جگہ مشینوں کا استعمال شروع ہوا سائنسی تجربات اور تحقیقات کی روشنی میں مشینوں کا دور دورہ بڑھتا ہی گیا۔ مشین سے بنی ہوئی چیزیں سستی ملنے لگیں۔ دوسرے شاہان اودھ کے ساتھ ساتھ ان صنعتوں کی قدردانی اور ہمت افزائی بھی ختم ہوگئی۔ آج کل ان تمام صنعتوں کے کاریگروں میں صرف ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے ان کی تباہی، غریبی، بے کسی، کس مپرسی اور بے کاری ——— اور ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام اور حکومت انھیں سہارا دیں۔

(لکھنؤ سے براڈکاسٹ)

——— ختم شد ———

معمارِ تاج

عرصہ سے اس بات پر بحث ہوتی چلی آرہی ہے کہ تاج محل کی تعمیر دراصل کس کی کاوشِ دماغ کا نتیجہ ہے۔ مورخین اپنے اپنے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے ہیں۔ مثلاً فرگسن اعتماد الدولہ کے مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھ جاتا ہے کہ تاج کو غالباً علی مردان خان نے بنایا۔ یہ علی مردان خاں ایک ایرانی تھا جس نے ہندوستان میں آکر پناہ لی تھی۔ مجمدار نے اپنی کتاب "مغلوں کا شاہی آگرہ" (زبان انگریزی) میں بھی اسی علی مردان خاں کا نام لیا ہے۔ ڈاکٹر برگیس بھی اسی خیال کے حامی ہیں ڈاکٹر وی، اے، اسمتھ اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ شاہجہان کے زمانے کی فارسی تاریخوں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ وہ آگرہ کے ایک باشندہ استاد عیسیٰ کا نام لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تاج کی تعمیر میں خاص ہاتھ اسی کا ہے۔ مشہور سیاح سلیمن کا خیال ہے کہ ایک ماہر فرانسیسی انجینیر مسمیٰ بہ آسٹن دی بورڈو دراصل تاج محل کا خاص معمار ہے اور اسی نے شاہجہاں کے خواب کو سنگ مرمر میں ڈھال دیا ہے۔ ایک اور مورخ پادری

سیاسیجیان منرگ کا کہنا یہ ہے کہ ایک اطالوی مسافر مسمیٰ یہ عنطرونیو ورنیو جو شاہ جہاں کی ملازمت میں تھا۔ تاج محل درحقیقت اس کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ اس خیال کو صحیح ماننے پر تیار معلوم ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ورونیو ہندوستان ہی میں مر گیا تھا اور لاہور میں مدفون ہوا تھا ممکن ہے کہ استاد عیسیٰ نے اس کے بعد یہ کام سنبھال لیا ہو۔

اصل معمار

تحقیق اور جستجو کا بھلا ہو کہ آخرکار تاج محل کے صحیح معمار یا انجینئر کا نام اب معلوم ہو گیا ہے اور یہ "نادر العصر استاد احمد لاہوری" ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مضمون "لاہور کا ایک معمار خاندان" ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا اس میں اسی استاد کا نام لے کر بتایا تھا کہ یہ شاہجہاں کے عہد کا ایک بہت بڑا معمار تھا۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے "تاج محل کی تاریخ" پر پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان کے اس مقالے میں (جو فرانسیسی زبان میں ہے) اس بات کو پوری طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ استاد احمد لاہوری ہی جن کا خطاب "نادر العصر" تھا تاج محل کے واقعی معمار ہیں۔ یوں تو احمد لاہوری کا نام شاہ جہاں کے زمانے کی کئی متفرق تاریخوں مثلاً عمل صالح، بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید لاہوری اور تاریخ شاہجہاں (دارالعلوم دیوبند کا ایک مخطوطہ) میں مذکور ملتا ہے لیکن دراصل اس بات کا صحیح پتہ کہ یہی استاد احمد لاہوری تاج محل کے فنکار تھے۔ استاد احمد لاہوری کے دوسرے بیٹے حافظ لطف اللہ مہندس

خود ایک ماہر فن معمار تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی بالخصوص ریاضی کی۔ "دیوان مہندس" جو خود انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ نبنگلور کے سید محمود صاحب کے پاس موجود ہے۔ لطف اللہ مہندس اور تاج محل کے معمار خاص استاد لاہوری کے متعلق مزید تفصیلات ایک قلمی نسخہ باغستان نامی سے جو لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے معلوم ہو سکتی ہیں۔ باغستان کا مصنف امام الدین ریاضی ہے جو حافظ لطف اللہ کا بیٹا تھا۔

استاد احمد لاہوری شاہ جہاں کے دربار کا خاص معمار یا مہر تعمیرات تھا اس کی فن تعمیر میں مہارت اور غیر معمولی استعداد کے باعث شاہ جہاں نے "نادر العصر" کے ایسے گراں بہا خطاب سے اسے سرفراز کیا تھا اور اس کے بیٹے حافظ لطف اللہ کو "مہندس" کا خطاب دیا تھا۔ استاد احمد کا انتقال ۱۰۵۹ھ میں یعنی تاج محل کی تکمیل کے کوئی نو برس بعد ہوا۔ یہ اسی کا ذہن اور دماغ تھا جس نے تاج محل اور لال قلعہ جیسی نادر اور بے نظیر عمارتیں تعمیر کر دیں۔ "دیوان مہندس" کے درج ذیل اشعار سے یہ بات قطعی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے ؎

احمد معمار کہ در فنِ خویش — صد قدم ز اہل ہنر بود بیش
کرد بحکم شہِ کشور کشا — روضۂ ممتاز محل را بنا
باز بحکم شہِ انجم سپاہ — شاہ جہاں داورِ گیتی پناہ
قلعۂ دہلی کہ ندارد نظیر — کرد بنا احمدِ روشن ضمیر
این دو عمارت کہ بیاں کردہ ام — در صفتش خامہ رواں کردہ ام

یک ہنر از گنج ہنر ہائے اوست
یک گہر از کانِ گہر ہائے اوست

احمد لاہوری اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اس کی تخلیق تاج ضیا پاش ہے اور جلوے بکھیر رہی ہے ۔ محبت اور اشک کی کارفرمائیوں نے جسے نہ صرف تر و تازگی بخشی بلکہ زندہ جاوید بنا دیا ہے اور وہ ہاتھ جنہوں نے ممتاز محل اور شاہ جہاں کے روحانی رشتے کی عکاسی کی شاید پردۂ گمنامی میں ہی رہتے اگر اس خاندان کے ایک فرد نے فخر، عزت اور احترام کے ملے جلے جذبات اور خود اپنی شمولیت کے تحت اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کر دیا ہوتا !!

مغل فن مصوری

ڈاکٹر وی۔ اے۔ اسمتھ کے اس قول نے کہ "ہندوستانی مصوری کی تاریخ اجنتا کی گپھاؤں کی نقاشی (FRESCO PAINTING) اور اکبر اعظم کے دور میں اس کے احیاء کے درمیانی حصہ میں ایک سادہ لوح کی حیثیت رکھتی ہے" بحث و فکر کے دروازے محققین کے لیے کھول دیے۔ ایک دوسرے مغربی نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ فتحپور سیکری کی دیواروں پر بنی ہوئی تصویریں ایسا معلوم ہوتا ہے سیدھے جنت سے آئی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اجنتا اور فتحپور سیکری کے درمیانی طویل وقفہ کے اندر بھی ہندوستان میں فن مصوری ترقی پذیر رہا۔ بہت سے لوگ جوش میں آکر یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ اکبر کے دور حکومت میں فن مصوری میں جو تھوڑی بہت تبدیلی تکنیک اور رنگوں کی آمیزش میں ایرانی مصوروں کی مغل دربار میں موجودگی کی وجہ سے ہوئی۔ وہ سطحی تھی۔ ملکی فن مصوری کے بنیادی اصول اپنی جگہ پر قائم رہے اس لیے مغلیہ دور کی مصوری کو ایک خصوصی اور انفرادی حیثیت دینا غلط ہے

لیکن ایرانی مصوری کے دلدادہ مغلیہ عہد کی مصوری کو خالص ایرانی کہتے ہیں جس میں سطحی طور پر مقامی رنگ نمایاں ہے۔ یہ دونوں نظریے غلط ہیں واقعہ یہ ہے کہ مغل فن مصوری ایران اور اجنتا کا حسین سنگم ہے، ایک دلفریب آمیزش جو اپنے خدوخال میں نہ خالص ایرانی رہا اور نہ قدیم آریائی، بلکہ نئے ہندوستان کا غماز اور ترجمان۔

مسلم فن مصوری کا آغاز :-

یہ امر مسلمہ ہے کہ اسلام کی پابندیوں کے باوجود فن مصوری نے اسلامی ممالک میں میں نشو ونما پائی لیکن اس میں زندگی کے آثار اس وقت نمودار ہوئے جب اسلام کا تسلط ایران اور وسط ایشیا پر بھی ہو گیا منگول فن مصوری کے شیدائی تھے اور ایلخانی خاندان کے حکمرانوں نے اسے بہت بڑھاوا دیا۔ انھوں نے چینی فنکاروں کو بلایا اور اپنے محلوں کی آرائش اور زیبائش کے لیے انھیں مقرر کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب مسلم فن مصوری نے جنم لیا۔ ایرانی اور چینی فنکاروں کے اجتماع نے ایک نئے مکتب مصوری کی داغ بیل ڈالی لیکن شروع میں ایرانی اور چینی تکنیک اور تخیل ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتے رہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں تیموری خاندان کے فرماں رواؤں کی سرپرستی نے ایرانی فن مصوری کو ہندوستان سے باہر بھی ممتاز جگہ دلائی اور ایران کے صفوی حکمرانوں کے عہد میں بہزاد نے ایرانی فن مصوری میں چار چاند لگا دیے۔ فن مصوری کے بہت سے مرکز قائم ہو گئے ہرات کے حکمراں سلطان حسین مرزا کا دربار بھی ایرانی فن مصوری کا مرکز تھا۔ بابر یہیں جدید فن مصوری سے روشناس ہوا۔

بابر کو سیاسی الجھنوں سے فرصت نہ ملی کہ وہ اس فن کی شاہانہ ہمت افزائی

اور سرپرستی کرتا لیکن بابر کا ذوق اس کے بیٹے ہمایوں کو ورثہ میں ملا۔ ہمایوں جب اپنا کھویا ہوا تخت و تاج دوبارہ حاصل کرنے کے لیے عازم ہندستان ہوا تو یگانہ روزگار مصور میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اس کے ساتھ تھے۔

مغل فن مصوری کی داغ بیل

ہمایوں کو فن مصوری سے بڑی دلچسپی تھی وہ فن کاروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتا تھا۔ میر سید علی اور خواجہ عبدالصمد نے نئی راہوں سے ہندوستانیوں کو روشناس کیا۔ ہمایوں نے ان فن کاروں کے ذمہ "داستان امیر حمزہ" کی آرائش سپرد کی اور اس طرح مغل فن مصوری کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

اکبر اعظم کی فیاضی فن کاروں کی ہمت افزائی اور فن مصوری سے اس کے لگاؤ کے شہرہ نے شیراز اور تبریز کے یکتائے زمانہ مصوروں کو ہندوستان آنے کی ترغیب دی مغل دربار میں ہندو مصور اور ایرانی فن کار ساتھ ساتھ کام کرنے لگے۔ ابتدائی دور کے شاہکاروں میں اکبر کی وہ تصویر جب وہ ہمایوں کی وفات کی خبر سن رہا ہے، شاہ ابوالمعانی کی گرفتاری اور تانسین کا مغل دربار میں پہنچنا خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

اکبر کی فن مصوری کی سرپرستی سے کٹر مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ لیکن ابوالفضل کہتا ہے کہ "شہنشاہ فن مصوری کو مطالعہ اور تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں"۔ اکبر نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ فن مصوری کو برا سمجھتے ہیں میں انھیں ناپسند کرتا ہوں۔ کیونکہ ایک مصور خدا کو پہچاننے اور جاننے کا زیادہ اہل ہے جب وہ ایک تصویر بناتا ہے لیکن اسے زندگی بخشنے میں ناکام رہتا ہے تو اس کا خیال

فورا اس ذات کی طرف جاتا ہے جو زندگی بخشتا ہے۔ جو خالق ہے " یہی اکبر کا فلسفہ تھا اور یہی باعث تھا اس کی فن مصوری کی سرپرستی کا۔

دربار کے فن کار براہ راست اکبر کی نگرانی میں تھے۔ سب تصویریں اس کے سامنے پیش ہوتی تھیں وہ ان کا جائزہ لیتا تھا اور عمدہ تصویروں پر انعام یا ماہانہ مشاہرہ میں ترقی دیتا تھا اس کے دربار میں سو سے زائد مصور تھے وہ خود بھی ماڈل کے طور پر بیٹھتا تھا۔

اکبر کو خدا نے بہت ہی جوہر شناس نظر عطا کی تھی۔ کمہار ذات کا دسونت اس کی نئی دریافت تھا۔ دسونت نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی دھاک ایرانی مصوروں پر بٹھا دی۔ وہ سب پر فوقیت لے گیا لیکن دسونت کی قبل از وقت موت فن مصوری کا بہت بڑا المیہ ہے۔

بساون دوسرا شخص تھا جسے اکبر نے اوپر اٹھایا اور بقول ابو الفضل وہ کئی معنوں میں دسونت سے بھی افضل تھا۔ علاوہ ازیں گجراتی، کشمیری اور پنجابی مصور بھی مغل دربار سے منسلک تھے اور ملاپ تخیل اور تناسب روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ مصوری میں بھی وہی روح کار فرما تھی جو ہم اکبری عہد کی "تعمیرات" "مذہبی پالیسی" "صلح کل" اور عام ملکی سیاست میں پاتے ہیں یہ سارے راستے قومی یکجہتی کی طرف جاتے تھے۔

اکبر کے دور حکومت میں فن مصوری کا "زریں عہد" وہ تھا جب فنکار اپنی فنی تخلیق فتحپور سیکری کی دیواروں پر کر رہے تھے فتحپور سیکری آج بھی اپنی ویرانی اور زبوں حالی کے باوجود مغل فن مصوری کے غیر فانی شاہکاروں کو اپنے آغوش میں

چھپائے ہوئے ہے۔ خوابگاہ، بی بی مریم کی کوٹھی اور حمّام کی دیواروں کو مزیّن کرنیوالی مصوری دراصل وہ گمشدہ کڑیاں ہیں جو اجنتائی روایات کو وسط ایشیا سے برآمد شدہ بہزاد کے فن سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ اجنتا کی فنی روایات ہندوستان کے فن مصوری کا حصہ تھیں مگر اکبر نے اس پہ اکتفا نہ کی بلکہ بہزاد کے فن کی قلم اجنتا کے فن میں لگادی اور فن مصوری میں ایک نئے مکتب کی بنیاد ڈالی۔ مغل اسکول میں موضوع تو خالصتاً ہندوستانی تھے مگر ان کا اظہار بہزاد کے فن کے مطابق تھا۔

جہانگیر اور شاہجہاں:

مغل مصوری جہانگیر کے عہد میں اپنے شباب پہ پہنچ گئی۔ ارتقاء کی اس منزل پہ اس نے ایرانی مصوروں کے فن پاروں کی نقالی ترک کردی۔ اب مغل مصوری کو اس کا سلیقہ آگیا تھا کہ وہ ایرانی یا قدیم ہندوستانی تصویروں میں سے بہتر شاہکاروں کا انتخاب کرسکے، اور ان کی اچھائیاں اپنائے۔ اس طرح ایرانی فن اور مقامی روایات ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں۔ بشن داس، فرخ بیگ، ابوالحسن، منصور، منوہر اور گوبردھن۔ جہانگیر کے دربار کے مایۂ ناز مصور تھے۔

جہانگیر کے دور میں مغل فن مصوری میں بہت لچک پیدا ہوگئی۔ موضوع کے انتخاب اور رنگ آمیزی میں انفرادی رجحانات وسیع تر ہوگئے۔ اس عہد کا بہترین شاہکار عنایت خاں کی تصویر ہے۔ عنایت خاں طویل علالت کے باعث صرف گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوکر رہ گئے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے صحیح خدوخال کی کامیاب تصویر کشی یقیناً قابل تحسین ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ تصویر مکمل ہونے کے دوسرے ہی دن عنایت خاں کا انتقال ہوگیا۔ مغل تصویریں تاریخی اہمیت کی حامل ہوتی گئیں جب

ہمعصر واقعات کی منظر کشی بھی ہونے لگی۔

مغل فن مصوری پر یوروپی اثرات اکبر کے عہد ہی سے پڑنے لگے تھے۔ عیسائی مبلغ اور تاجر یوروپ کے مصوروں کے شاہکار اکبر کو تحفتہً پیش کیا کرتے تھے۔ اور اکثر شہنشاہ کے حکم سے ہندوستانی فن کاران تصویروں کی نقلیں تیار کرتے تھے جہانگیر کے دور حکومت میں یوروپ سے ربط ضبط زیادہ بڑھا۔ سرطامس رو اپنے ساتھ بہت سی تصویریں لایا تھا۔ پرسی براؤن کا خیال ہے کہ مغربی اثرات جہانگیر کے بعد بہت زیادہ نمایاں ہوگئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یوروپی اثرات مغل فن مصوری پر زیادہ اثر انداز نہ ہو سکے۔

شاہجہاں کو قدرت نے حسّاس دل و دماغ عطا کیا تھا اور فنون لطیفہ سے اسے خاص لگاؤ تھا لیکن اسلامی شریعت اس کے سدّ راہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چل سکے۔ شاہجہاں کی سرپرستی کی کمی کو شہزادہ دارا شکوہ نے پوری فیاضی سے پورا کیا۔ دارا شکوہ کے حکم سے دربار کے مصوروں نے چھوٹی چھوٹی تصویروں (MINIATURE . PAINTING) کا ایک مجموعہ تیار کیا جو نہایت نفاست سے ایک جلد میں جز و بند کیا گیا۔ شہزادہ نے اس مجموعہ کو اپنی محبوبہ بیگم نادرہ بانو کو تحفتہً پیش کیا۔ اس مجموعہ کو "نادرہ بانو البم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نادرہ بانو البم ہند کے قرون وسطیٰ کی فن مصوری کا گوہر گراں مایہ ہے اسے فن مصوری کا تاج محل کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

اورنگ زیب شریعت اسلامی پر سختی سے کار بند رہا اور اس کے دور حکومت میں فنون لطیفہ کی حکومت کی طرف سے ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ شاہی سرپرستی سے

محرومی کی وجہ سے فنون لطیفہ کا سرسبز و شاداب و حسین باغ مرجھانے لگا۔ اس نے رقص و سرود کو جلاوطن کر دیا اور نغمہ سرائی زندہ درگور ہو گئی۔ ایسی فضا میں فن مصوری کے فروغ کے لیے گنجائش نہ رہی۔ صرف چند مصور عالمگیری دربار سے وابستہ رہ گئے تھے۔ اورنگزیب کے نااہل اور کمزور جانشینوں سے اکبری و جہانگیری سرپرستی کی توقع تحصیل حاصل تھی لیکن اکبری و جہانگیری روایات اور مغل فن مصوری نے نئے ہندوستان کے ذوق لطیف کو گرمایا اور فنون لطیفہ اور فن مصوری کے تحفظ و ترویج کا کام، جس سے تیموریہ خاندان کے وارث دستکش ہو چکے تھے، آج جمہوری ہندوستان میں عوامی ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔

نور جہاں بیگم

ہندی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں کوئی بھی نام اتنی رومانیت کا حامل نہیں ہے جتنا کہ "نور جہاں"، اور مغل شہنشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت کا کوئی بھی واقعہ اس قدر جاذبِ توجہ نہیں ہے جتنا کہ جہانگیر کی شادی نور جہاں سے۔ نکبت و افلاس کا مارا ہوا، گردشِ روزگار کا ستایا ہوا، مرزا غیاث بیگ معہ اہل و عیال ایران سے عازمِ ہندوستان ہوا۔ کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ یہ تباہ حال قافلہ ابھی قندھار ہی پہونچا تھا کہ ایک ننھی سی جان عالمِ وجود میں آئی۔ نہ مناسب سواریاں ساتھ تھیں اور نہ تسلی بخش زادِ راہ، کیسے اور کیوں کر نوزائیدہ بچی کی کفالت ہو سکے گی۔ والدین نے دل پر پتھر رکھا اور بچی کو ایک جھاڑی میں رکھ کر آگے بڑھ گئے۔ نحوست کو پیچھے چھوڑ دیا گیا، لیکن تقدیر مسکرا رہی تھی، ستارے چشمک زنی کر رہے تھے انسانی عقل کی کم مائیگی پر ...... کون جانتا تھا کہ ایک دن یہ لڑکی ایک عظیم المرتبت شہنشاہ کی ملکہ اور ایک عظیم الشان سلطنت کی حکمراں ہوگی۔

ابھی مرزا غیاث بیگ ایک منزل بھی آگے نہ گیا تھا کہ ایک تیز رفتار قافلہ نے اسے آلیا۔ قافلہ سردار اس بچی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا۔ تلاش تھی ایک دودھ پلانے والی کی۔ مرزا غیاث بیگ کی بیوی خود اپنی بچی کو دودھ پلانے پر مامور ہوئی۔ منحوس ولادت اپنے خاندان کے لیے چشم زدن میں رحمت بن گئی۔

مہرالنساء ایک نازک اندام، حسین اور پروقار لڑکی نکلی۔ مہرالنساء کا نام آتے ہی ایک سبک جسم، بیضاوی چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی نیلی آنکھیں، گلاب جیسے رخسار اور پتلے پتلے ہونٹوں کا ایک مجسمہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

جب نور جہاں سترہ سال کی ہوئی تو اس کی شادی علی قلی استجلو سے کر دی گئی۔ علی قلی استجلو ایران کا باشندہ تھا۔ وہ اعلیٰ خیالات، ہمت مردانہ اور عملی خصوصیات کا حامل تھا وہ شاہ اسمٰعیل صفوی ثانی کا سفرا جی تھا۔ اپنے آقا کی وفات کے بعد اس نے ایران کو خیرباد کہا اور تلاش معاش میں نکل پڑا۔ گھومتا پھرتا ملتان پہنچا جہاں عبدالرحیم خان خاناں سے ملاقات ہوئی۔ خان خاناں ٹھٹھہ کی بغاوت فرو کرنے جا رہے تھے۔ علی قلی بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اس معرکہ میں اس نے اپنے جوہر دکھائے اور خان خاناں کو متاثر کیا۔ صلہ میں اسے ایک منصب عطا کیا گیا۔ آگرہ واپس آنے کے بعد خان خاناں کے توسط سے وہ درباری حلقہ میں متعارف ہوا۔ اور شہزادہ سلیم کے خادموں میں اسے جگہ ملی۔ اس نے شہزادہ کی خدمت کمال خلوص سے کی۔ ایک مرتبہ تو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر ایک شیر سے خالی ہاتھ مقابلہ کر کے اسے مار ڈالا۔ شہزادہ نے خوش ہو کر اسے شیر افگن کا خطاب عطا فرمایا۔ جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو علی قلی شہزادہ کا ہمنوا تھا۔ حالاں کہ آگے چل کر اس نے شہزادہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جب سلیم تخت نشین ہوا تو اس نے علی قلی کو بردوان میں

ایک جاگیر دی۔ علی قلی مہرالنساء کے ساتھ بردوان میں جاکر سکونت پذیر ہوگیا۔

مہرالنساء نے وفاداری، خلوص اور جمعیت سے علی قلی کا ساتھ دیا۔ ۱۶۰۶ء میں علی قلی کو بغاوت کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ مہرالنساء دربار روانہ کر دی گئی جہاں وہ شہنشاہ جہانگیر کی والدہ کی خدمت پر مامور کی گئی۔ چار سال کے وقفہ کے بعد ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے اس سے شادی کر لی۔

عہد جہانگیر کے مؤرخ ڈاکٹر بینی پرشاد نے مندرجہ بالا واقعات کو ہمعصر تاریخوں کی بنیاد پر صحیح ثابت اور تسلیم کیا ہے لیکن سترہویں صدی عیسوی کے وسط سے جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں واقعات کا رنگ دوسرا ہے ان کی روایت یہ ہے کہ شہزادہ سلیم نے مہرالنساء کو ایک باغ میں محوِ خرام پایا۔ عشق کا تیر سینہ میں پیوست ہو گیا۔ دو دھڑکتے دل قریب آگئے۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اکبر اعظم تک پہنچی جو ان واقعات پر بہت برہم ہوا گو شہزادہ سلیم مہرالنساء کو اپنی رفیقۂ حیات بنانا چاہتا تھا لیکن اکبر نے اس کا ہاتھ شیر افگن کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایام شہزادگی میں جو زخم سلیم کے دل پر لگا تھا وہ پھر مندمل نہ ہو سکا۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے شیر افگن کو بنگال ایسے دور دراز مقام پر پھینک دیا اور پھر اپنے ایک رشتہ دار اور معتمد قطب الدین خاں کے ذریعے سے قتل کرا دیا۔

مؤرخین میں اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہے۔ کچھ جہانگیر کو علی قلی استجلو کا قاتل سمجھتے ہیں اور کچھ اس کو اس سے بری الذمہ۔ جب ہم واقعات کو تحقیق و تدقیق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو حالانکہ عینی شہادت کا فقدان ہے، حالات ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جہانگیر کے دامن پر شیر افگن کے خون کے چھینٹے ضرور ہیں۔

مہرالنساء اور سلیم کی شادی ہندی قرون وسطیٰ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت

رکھتی ہے۔ جہانگیر نے پہلے مہرالنسا، کو "نورمحل" اور پھر "نورجہاں" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ نورجہاں نے پورے پندرہ سال ملک اور شہنشاہ دونوں پر فرمانروائی کی اور اس عرصہ میں اسکی شخصیت سب پر غالب رہی۔

نورجہاں کی سیرت:

نورجہاں ذہین، طباع اور باریک بین خاتون تھی۔ حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت سے مالامال تھی۔ تیراندازی اور بندوق چلانے میں مشاق تھی۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ نورجہاں بیگم نے ایک مرتبہ دو گولیوں سے چار شیر مارے۔ اس واقعہ پر ایک شاعر نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے۔

نورجہاں گرچہ بظاہر زن است — درصف مرداں زن شیر افگن است

نورجہاں کو یتیموں اور بیواؤں سے خاص ہمدردی تھی۔ اگرچہ نورجہاں بیگم غیر معمولی صفات کی حامل تھی لیکن وہ اقتدار کی خواہاں تھی اور سازش اور جوڑ توڑ میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔

سیاست کے میدان میں:

نورجہاں بیگم نے بساط سیاست پر نہایت ہی ذہانت اور چابکدستی سے طبع آزمائی کی اور وقت کے مانے ہوئے کھلاڑی اس کے سامنے چاروں شانے چت نظر آئے۔ ابتداء میں اس نے شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو اپنا آلۂ کار بنایا اس میں نورجہاں نے کوئی غلطی بھی نہیں کی۔ خرم اپنے وقت کا ممتاز سپہ سالار، ولیعہد سلطنت اور بہترین مدبر تھا، کامیابی اس کے قدم چومتی تھی۔ نورجہاں شہزادہ خرم کا انتخاب کر کے اور اس کو اپنا دست راست بنا کر نہایت تیزی سے حکومت

کی مختار کل بن گئی۔ جہانگیر آہستہ آہستہ منظر سے ہٹتا گیا وہ یوں بھی نورجہاں کی محبت میں سرشار تھا۔ کہا کرتا تھا کہ آدھ سیر گوشت اور ایک سیر شراب کے عوض اس نے سلطنت نورجہاں بیگم کو بخش دی ہے اسی پر جہانگیر نے قناعت نہ کی بلکہ نورجہاں کے نام سے سکوں کو بھی زینت بخشی گئی ہے۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

لیکن شہزادہ خرم آزاد خیال اور آزادی پسند انسان تھا۔ کب تک نورجہاں کے زیر اثر رہتا۔ نورجہاں مکمل فرمانبرداری کی خواہاں تھی۔ شہزادہ خرم مساویانہ تعاون میں یقین رکھتا تھا۔ نورجہاں نے محسوس کیا کہ خرم اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ لہذا اس نے شہریار کو اپنا آلہ کار بنانا شروع کیا۔ نورجہاں نے شہریار کو آگے بڑھایا اور جہانگیر کو خرم کی طرف سے اس حد تک بدظن کر دیا کہ وہ اپنے ہونہار بیٹے کو "بے دولت" کہنے لگا۔

شہزادہ خرم کی سرکوبی کے لیے نورجہاں نے مہابت خاں اور شہزادہ پرویز کو ابھارا۔ مہابت خاں کو خان خاناں کا خطاب دیا اور شہزادہ پرویز کو ولیعہد سلطنت بنانے کا وعدہ کیا لیکن جب شہزادہ خرم کی بغاوت ناکام ہوئی اور وہ ناسک میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگا تو نورجہاں نے شہزادہ پرویز کے خلاف سازش کی اور اس کو ولیعہدی سے محروم رکھا۔

نورجہاں مہابت خاں کو خرم کے خلاف لڑا چکی تھی۔ مقصد پورا ہو چکا تھا اب اس نے مہابت خاں کو خاک میں ملانے کا منصوبہ تیار کیا۔ معزول اور سن رسیدہ عبدالرحیم کو بلایا اور اس کو پھر خان خاناں کے خطاب سے نوازا۔ عبداللہ خاں اور خانجہاں لودی

کو امید یں بندھائیں تاکہ وہ مہابت خاں اور شہزادہ خرم پر نظر رکھیں۔

بنگال سے مہابت خاں کو حساب فہمی کے بہانہ بلایا۔ دریائے جہلم کے کنارے میدان کارزار گرم ہوا۔ مہابت خاں کی کامیابی اور جہانگیر کی گرفتاری پھر خود نور جہاں بیگم کا سینہ سپر ہو کر جہلم میں کود پڑنا اور جہانگیر کو رہا کرالانا۔ وہ کارنامہ ہے جس پر ہمت، شجاعت اور استقلال کو بھی ناز ہے۔ بہر صورت مہابت خاں کا بھی ستارہ غروب ہونے لگا۔

اپنی پوزیشن کو اور بھی مضبوط بنانے کے لیے نور جہاں بیگم نے بد قسمت شہزادہ خسرو کے لڑکے شہزادہ بلاقی کے طرفداروں کو بھی اپنایا اور شہزادہ بلاقی کو طفل تسلیوں سے بہلاتی رہی کہ وہ اپنے دادا یعنی جہانگیر کے تخت کا وارث ہوگا۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات کے ساتھ ساتھ نور جہاں کا بھی ستارہ اقبال غروب ہو گیا اس کے اقتدار پر کاری ضرب لگی اور تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ نور جہاں نے غلبہ کی آخری کوشش کی شہریار کو شہنشاہ نامزد کر کے، لیکن شکست وہ بھی اپنے بھائی آصف خاں کے ہاتھوں مقدر ہو چکی تھی۔ اگر ہم عمل صالح کے مصنف محمد صالح کمبوہ کے بیان پر یقین کریں تو نور جہاں نے آصف خاں کو بھی قتل کرا دینا چاہا لیکن وقت کا دھارا اس کے خلاف تھا۔

شہزادہ خرم آصف خاں کا داماد تھا۔ آصف خاں نے نہایت حکمت عملی اور تدبر سے کام لے کر شہزادہ خرم کو ہندوستان کے تخت پر بٹھا دیا۔

نور جہاں بیگم کا امور سلطنت میں دخل دینا اس وقت تک حق بجانب تھا جب تک جہانگیر زندہ تھا۔ اس نے نہ صرف ملکی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر سلطنت کو

انتشار سے بچایا بلکہ جہانگیر کو قبل از وقت موت کے پنجہ سے بھی نجات دلائی۔ جہانگیر سے شراب تو نہ چھڑا سکی لیکن اس کی مقدار بہت ہی کم کرا دی اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ سلطنت کے معاملات میں دلچسپی لے سکے۔ اگر نور جہاں نے اپنے آپ کو پارٹی بازی سے الگ رکھا ہوتا تو اس کا نام تاریخ کے اوراق میں زریں حروف سے لکھا جاتا۔ وہ شہنشاہ وقت کی ملکہ تھی بلکہ خود حاکم تھی۔ انصاف پسندی اسے عوام اور خواص میں ہر دلعزیز بنا دیتی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اقتدار کی خواہش نے اسے اندھا بنا دیا حالانکہ اوّل الذکر صورت میں نہ صرف وہ مقبول، محبوب اور محترم ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک حکمران کی ہوتی۔ جہانگیر کی موت کے بعد اقتدار کی جدوجہد اس کی دوسری غلطی تھی۔ لیکن ہم اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جب وہ بازی ہار گئی تو اس نے سیاست سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی یہاں تک کہ شاہجہاں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اسے نظر بندی سے رہائی ملی۔

نور جہاں کے اثرات سلطنت مغلیہ پر:

یہ صحیح ہے کہ نور جہاں بیگم جہانگیر کے آخری ایام کی خانہ جنگی کی ذمہ دار ہے۔ یہ اس کی پالیسی کا لازمی نتیجہ تھا کہ شہزادہ خرم کو بغاوت کرنا پڑی، جلاوطنی کی زندگی گزاری اور سلطنت میں انتشار پھیلا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نور جہاں بیگم کا دور اقتدار سلطنت مغلیہ کے لیے خوشگوار ثابت ہوا۔ جہانگیر کی حکومت کا استحکام نور جہاں کا مرہون منت ہے۔

نور جہاں بیگم نفاست اور ذوق سلیم میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ نہ صرف ہندوستان کی ملکہ تھی بلکہ ہندوستانی تمدن اور معاشرہ کا منارہ تھی۔ فیشن کی ابتدا اس سے ہوتی تھی اس نے حسن اور کفایت شعاری کو ساتھ پروان چڑھایا

وہ تہذیب و شائستگی، ذوق و لطافت کی جان تھی۔ شعر گوئی میں اسے کمال حاصل تھا حاضر جوابی میں جواب نہیں رکھتی تھی۔ کہتے ہیں کہ رمضان المبارک کا مہینہ جہانگیر کے لئے بڑا صبر آزما ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ اور ملکہ دونوں عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ جہانگیر کو چاند نظر آگیا اس نے خوش ہو کر ملکہ کو مخاطب کیا ؎ ہلال عید براوج فلک ہویدا شد بیگم نے فوراً مصرعہ لگایا ؎ کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد۔

فن تعمیرات میں بھی نور جہاں بیگم کا ایک خاص مقام ہے۔ اعتماد الدولہ (مرزا غیاث بیگ) کا مقبرہ، جسے نور جہاں بیگم نے بنوایا تھا اپنی فنی لطافت میں بے نظیر ہے اور مغل تعمیرات پر نسوانی اثرات کا مظہر بلکہ یوں کہئے کہ ہندوستانی فن کاروں کی یہ درس گاہ تھی جہاں ان کے فن کو کمال حاصل ہوا جس کا نقطۂ عروج ہم تاج محل میں دیکھتے ہیں۔

لیکن نور جہاں جہانگیر کیلئے کوئی بہت عالی شان مقبرہ نہ بنوا سکی۔ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اس نے بقیہ زندگی لاہور میں جہانگیر کی قبر کی مجاوری میں بسر کی اور انتقال کے بعد جہانگیر کے پہلو میں جگہ پائی۔

ایں ہمہ ہیچ است چوں می بگزرد
بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار

(سعدی)

ہندوستان بابر کی نظر میں

ظہیر الدین محمد بابر کی پرکشش شخصیت، شاعرانہ مزاج اور رومان سے بھری ہوئی زندگی اسے اسلامی تاریخ کا ایک اہم کردار بناتی ہے۔ عام طور پر قتل و غارتگری، فتح و شکست اور سیاسی شعبدہ بازیوں کے درمیان بابر ایک انسان کی حیثیت سے پس منظر میں چلا جاتا ہے یہ صحیح ہے کہ اس کی رگوں میں تیموری اور چنگیز خانی خون دوڑ رہا تھا۔ اس کی بھی زندگی میدان جنگ میں بسر ہوئی اور تگ و دو کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی بھی جگہ اطمینان سے نہ بیٹھ سکا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جس چیز نے بابر کو حیات جاوید بخشی وہ ہے اس کی انسانیت اور انسان دوستی، حساس دل و دماغ اور ایک ادیب اور فنکار کی پاکیزہ سادگی ـــ اور ان تمام خوبیوں کا مظہر ہے اس کی خود نوشت سوانح حیات "تزک بابری" یا "بابر نامہ" خاندان تیموریہ کا وقار اور دبدبہ، جلال اور جبروت اور شان و شوکت داستان پارینہ بن چکی ہے لیکن "بابر نامہ" اب بھی وقت پر خندہ زن ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندگی سے بھرپور ـــ رہتی دنیا تک رہے گا ـــ امر، امٹ۔

بابرنامہ بابر کی زندگی اور کردار کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لاشوں پر گھوڑے دوڑانے والا اپنے ایک دوست کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ انتہائی سرد راتوں میں جب برف باری ہو رہی ہوتی ہے وہ اپنے سپاہیوں کو غار کے اندر سونے کی ہدایت کرتا ہے اور خود اس کے دہانہ پر رات بسر کرتا ہے۔ وقت کے چہرہ سے نقاب ہٹانے والا اپنی شادی کے موقع پر دلہن کی طرح شرماتا ہے۔ اس کا اعتراف کرتا ہے کہ حجلۂ عروسی کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وہ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ "نقاب کشائی" کی رسم کی ادائیگی کے وقت اس کے ہاتھوں میں لرزہ تھا۔

بابر نے محبت بھی کی۔ اگر وہ ہندوستان کا شہنشاہ نہ ہوتا تو اس کا نام قیس اور فرہاد کے ساتھ لیا جاتا۔ فراق یار میں بے سدھ، کھانے کی فکر نہ تن بدن کا ہوش، ننگے سر، ننگے پاؤں، بادیہ پیمائی میں مصروف، معشوق کی بے مہری کا یوں شکوہ کرتا ہے ؎

یا ہیچ کس چوں من خراب و عاشق و رسوا مباد
ہیچ محبوبے چو تو بے رحم و بے پروا مباد

اور اگر اچانک دوست کا دیدار ہو جاتا ہے تو اس کے رخ زیبا کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھ پاتی ہے۔ عجیب الجھن ہے ؎

شوم شرمندہ ہر گہ یار خود را در نظر بینم
رفیقاں سوئے من بینند و من سوئے دگر بینم

اسی بابرنامہ میں بابر نے ہندوستان کے بارے میں اپنے تاثرات

قلم بند کئے ہیں جو کچھ اس کے مشاہدہ میں آیا بے خوف و خطر اور نہایت ایمانداری سے بیان کردیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ پورے ملک کا دورہ نہ کر سکا۔ شمالی ہندوستان ہی اس کی آماجگاہ رہا۔ دوسرے ہندوستان کے متعلق اسے مجموعی طور پر اپنی رائے قائم کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ جو کچھ اس نے دیکھا جیسا پایا اسے ویسا ہی لکھتا چلا گیا۔ ہندوستانی سماج اور زندگی کی منظر کشی بہت جاندار ہے حالانکہ کہیں کہیں اس کے تبصرے پر تنقید ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلا فرق بابر نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان، خراسان (دریائے سندھ کے مغرب کی سرزمین) سے مناظر، باشندوں اور رسم و رواج کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے "ہندوستان کے بسنے والے، سیاہ فام ہندو ہیں۔ تھوڑی بہت آبادی ترکوں اور افغانوں کی کی بھی ہے" زیادہ تر لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ قصبات اور شہر بہت ہی کم اور گندے ہیں۔ بابر نے خصوصیت سے ہندوستانیوں کی قبائلی ذہنیت کا جائزہ لیا ہے لیکن یہ رائے صرف پنجاب کے قبیلوں مثلاً جاٹ، اہیر اور گوجر کے بارے میں صحیح ہو سکتی ہے جو اپنے اطوار اور طرز زندگی میں کسی حد تک وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں سے ملتے جلتے ہیں۔

ہندوستانی معاشرہ کی شروع شروع میں کوئی بھی چیز مہذب اور احساس برتری میں مبتلا غیر ملکی کو پسند نہ آئی۔ لوگوں کے لباس کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے بابر لکھتا ہے: "مرد (ہندو) صرف ایک لنگوٹہ پہن کر گھومتے پھرتے ہیں۔ عورتیں دو حصوں میں ساڑیاں پہنتی ہیں جس کا ایک حصہ ان کے سر دں

پر پڑا رہتا ہے۔ افغان خراسانیوں جیسا لباس پہنتے ہیں" یہ رائے پورے ہندوستان کے بارے میں صحیح نہیں ہو سکتی ہے۔ بابر نے جو کچھ دہلی، آگرہ اور ان کے اطراف میں دیکھا اسے ہی لکھا ہے۔ بابر نامہ میں کہیں کہیں اعلیٰ طبقہ کے مرد اور عورتوں کے لباس کا ذکر بھی ملتا ہے جو موجودہ فیشن کے مطابق ہے۔

ہندوستانی تہذیب اور تمدن بابر کو بہت ہی بے جان، خشک اور گھٹیا معلوم ہوا۔ آرام اور آسائش کے بہت سے لوازمات جو دریائے سندھ کے اس پار میسر تھے یہاں اسے نظر نہ آئے۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستانیوں کو سماجی زندگی کا شعور نہیں ہے۔ یہاں کلب ہیں نہ ٹھنڈے مشروب اور نہ پکا ہوا کھانا بازاروں میں ملتا ہے۔ یہ شاید درست بھی ہے کیونکہ ہندوستانی ہندو اور مسلمان اپنا اپنا کھانا اپنے اپنے گھروں میں پکاتے تھے اس وقت تک مسلمانوں کے یہاں ہوٹلوں کا رواج نہیں ہوا تھا اور نہ ہر قسم کا عمدہ اور لذیذ پکا پکایا کھانا دستیاب ہو سکتا تھا جیسی صورت کہ فی زمانہ ہے۔

گلبدن بیگم (ہمایوں نامہ) اور بابر متفقہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی عوام خوشی اور تیوہار کے موقعہ پر چراغاں کرنا نہیں جانتے ہیں لیکن اس پر مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں چراغاں کا دستور رہی نہ تھا کیونکہ کم از کم دیپ مالا یا دیوالی کے موقع پر چراغاں کرنے کے مذہبی رسوم اور فرائض یقیناً ہندوؤں نے مغلوں سے نہیں سیکھا ہے۔

بابر نے افغانوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے ۔ وہ بار بار لکھتا ہے کہ یہ قوم تہذیب اور شائستگی سے کوسوں دور ہے ۔ ان کو صحیح آداب معلوم ہیں اور نہ لطافت چھو گئی ہے۔ خواہ لباس کا مسئلہ ہو یا نشست و برخاست کا غالباً یہ ہو کہ افغان ایک پھوہڑ قوم تھی اور شستہ ، ذی عقل اور مہذب مغلوں کے مقابلہ میں جنگلی معلوم ہوتی تھی ۔ مثلاً لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مجلس سے اسے ایک افغان سردار بِبَن کو نکالنا پڑا کیونکہ اس نے اجازت لیے بغیر اس کے حضور بیٹھنے کی گستاخی کی تھی ۔ وہ افغانوں کے اکھڑ اور اجڈ طور طریقوں پر ناپسندیدگی نفرت اور مزاح کے ملے جلے جذبات سے طنز کرتا ہے ۔ لیکن بابر کا مقابلہ انھیں افغانوں سے ہوا تھا ۔ ہندوستان کا تخت اس نے انھیں سے چھینا تھا بابر کے انداز بیان میں جو تلخی ہے اس کے پیچھے رقابت اور دشمنی کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ۔ ہندوستان کے تخت و تاج کے والی بالکل ہی غیر مہذب اور جاہل ہوں قرین قیاس نہیں ہے ۔ دوسرے عوام اور خواص کا فرق بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جو قرون وسطیٰ کی اہم خصوصیت ہے

بابر نامہ میں جو کچھ اپریل، مئی اور جون کے مہینوں میں لکھا گیا ہے اس سے ہندوستان سے انتہائی مایوسی اور بددلی کا اظہار ہوتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستان ایک بنجر، اجاڑ اور بدصورت ملک ہے جہاں گرد و غبار کی فراوانی ہے ۔ یہاں شدت کی گرمی پڑتی ہے ۔ آبادیاں خال خال اور منتشر ہیں اور ہریالی اور سرسبزی کا دور دور تک نام و نشان نہیں ہے نہ باغات ہیں اور نہ رواں دواں نہریں اور ندیاں اسے یہاں خربوزے بھی دستیاب نہ ہو سکے ۔

لیکن جب برسات کا موسم شروع ہوا تو بابر ہندوستان کی قصیدہ خوانی میں رطب اللسان

نظر آتا ہے ۔ اس کی ساری شکائتیں دور ہو جاتی ہیں ۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ملک کے بہت سے حصوں کی پیداوار بہت اچھی ہے حالانکہ کاشتکار بہت جھگڑالو ہیں اور لگان کی ادائیگی میں بہت ہی بخیل اور سخت جان ۔ بابر یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر حکومت کے افسران سے چشمک ہو جائے تو دیہات کے رہنے والے راتوں رات گاؤں کو تباہ اور ویران کر کے ہجرت کر جاتے ہیں ۔ یہ رجحان راجپوتانہ میں بہت عام تھا۔ بابر معترف ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو حکمران کی عدم توجہی اور سرد مہری کے باوجود پھل پھول سکتا ہے اگر جنگ و جدل کا سلسلہ کافی عرصہ تک قائم نہ رہے ۔

لودی سلاطین کے دور حکومت میں ہندوستان کو کافی حد تک امن و سکون ملا ۔ معاشی اور اقتصادی خوشحالی پر ابراہیم لودی کے آخری سالوں کی بدنظمی کبھی زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالگذاری کا مناسب بندوبست تھا کیونکہ بابر لگانوں کی ایک مکمل فہرست پیش کرتا ہے ۔ عوام کی آسودگی اور خوشحالی سب سے بڑی وجہ تھی کہ بابر کی ہندوستان میں عام مخالفت ہوئی ۔ ہندو اور مسلمان ایک پرچم کے نیچے جمع ہو کر حملہ آور سے صف آرا ہوئے اور اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔

ہندوستان بابر کو بے اندازہ دولت کا ملک معلوم ہوا ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ملک اپنے اندر بہت ہی کم کشش اور جاذبیت رکھتا ہے اس کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہاں سونے اور چاندی کی افراط ہے اور لاتعداد صناع اور کاریگر یہاں موجود ہیں ۔ وہ اس بے بہا خزانہ سے من مانی رقم حاصل کر سکتا ہے ۔ بابر کا

یہ انداز فکر و نظر عام حملہ آوروں جیسا تھا اور ہندوستان کی اقتصادی تصویر کشی نامکمل ہے۔

بابر نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی اور دل کھول کر خرچ کیا۔ یہاں وہ فکر فردا سے آزاد تھا۔ اسے ہندوستان سے وہ لگاؤ اور اُنس نہ ہو سکا جو اس کے جانشینوں کے حصہ میں آیا۔ بابر تخت و تاج چاہتا تھا جو اس نے بزورِ شمشیر حاصل کر لیا لیکن اس کی روح کی گہرائیوں میں کابل کی محبت جاگزیں تھی۔ جہاں اُس نے اپنی آخری آرام گاہ بھی پسند کی۔

اسلامی ہند کی سماجی تاریخ (۱۶۰۵ء-۱۷۴۸ء)

مصنفہ

ڈاکٹر محمد یٰسین ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

پہلی بار اردو میں

عنقریب ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔ یہ بیش بہا تصنیف انگریزی میں شائع ہو کر ملک اور بیرونی ملک میں خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔

یہ کتاب ہندوستان پر اسلام کے اثرات اور اس کے نتیجہ پر سائنٹفک طور پر روشنی ڈالتی ہے اور ایسے بہت سے سوالات کے جواب دینے میں حادث ثابت ہوتی ہے جو عصر حاضر کے سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب بین الاقوامی دلچسپی کی حامل ہے۔ ماہرین سماجیات، ماہرین ہندوستانی ادب اور اسلامی تاریخ کے علماء کے لیے اس کتاب کے صفحات میں فکری غذا اور معنوی اہمیت موجود ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں بطور "مشتے نمونہ از خروارے" دو ایک موقر جرائد اور بلند پایہ علمی و ادبی شخصیتوں کی رائیں درج ذیل ہیں۔

"میں اسلامی ہند کی سماجی تاریخ کو پسند کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن (صدر جمہوریہ ہند)

"میں نے اس کتاب کو بہت دلچسپ اور سبق آموز پایا"

——— ڈاکٹر ذاکر حسین (نائب صدر جمہوریہ ہند)

"مصنف نے اپنی تحقیق کے پھل کو، الفاظ میں کفایت شعاری اور خیالات میں ایک ایسی سنجیدگی اور استواری کے ساتھ پیش کر کے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، جس کے لیے وہ بہت قابل مبارکباد ہیں۔"

——— سر جادو ناتھ سرکار

"یہ کتاب، ہندوستان میں مسلمانوں کے کردار کو گہرائی کے ساتھ تاریخی طور پر سمجھنے کے لیے ایک ایک ہونہار آغاز کا حکم رکھتی ہے ۔۔۔ اور اس لیے (اگر اسے تاریخی حیثیت کا حامل اور موجودہ صدی کے لیے بامعنی ہونا ہے) اس کے لیے ضروری تھا کہ اس میں طاقتوں اور کمزوریوں اور قدامت پسندی اور قدامت پسندی سے گریز، ان سب کا جائزہ لیا جاتا (چنانچہ اس کتاب میں ایسا ہی کیا گیا ہے)

——— پروفیسر ایچ۔ اے۔ آر گب

"مصنف نے اس کتاب کو ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار عمیق نظر مؤرخ کی حیثیت سے لکھا ہے"

——— الہلال قاہرہ

"مقدار مطالعہ، محنت، اب تک جو ماخذ اچھوتے تھے ان کا کھنگالنا، اور موضوع سے گہری واقفیت، یہ سب باتیں قابل تعریف ہیں۔ حقیقتاً یہ ایک عالمانہ کارنامہ ہے"

——— دی ہندو مدارس